معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے فی شمارہ سات روپے

پاکستان میں سالانہ دوسو روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس. ایم. کالج. اسٹریچن روڈ. کراچی

• سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں. بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

• رسالہ ہر ماہ کی ۵ ؍ تاریخ کو شائع ہوتا ہے. اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا.

• خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں.

• معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی.

کمیشن ۲۵٪ ہوگا. رقم پیشگی آنی چاہیے.

جلد ۱۶۳ ماہ شوال المکرم ۱۴۱۹ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۹۹ء عدد ۲

فہرست مضامین

شذرات

۳۰؍جنوری ۹۹ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی کورٹ کا جلسہ ہوا، یہ جلسہ طویل وقفہ کے بعد ہوا تھا، اسکی اور اس عرصہ میں ہونے والے بعض اقدامات کی وجہ سے ممبران میں کافی بے چینی اور برہمی تھی، تاہم جلسہ خوشگوار ماحول میں ہوا، ممبران کے جذبات کی ترجمانی مسٹر زیڈ۔کے۔ فیضان نے مدلل طور پر کی، انہوں نے اور بعض دوسرے ممبروں نے یونیورسٹی کے مسائل کو بہتر انداز میں حل نہ کرنے کی شکایت کی اور اس سلسلہ میں سینیر استاذوں کو نظر انداز کرنے، طلبہ کے معاملات کو وقار کا مسئلہ بنانے، یونین کے الکشن کرانے میں ٹال مٹول کرنے، ایک طالب علم کی شہادت، کئی بار یونیورسٹی بند کیے جانے، پُرامن ماحول نہ ہونے، آمرانہ انداز اپنانے اور بعض ملی و مذہبی مسائل میں نامناسب بیان دینے وغیرہ کا ذکر کیا۔ آخر میں وائس چانسلر صاحب نے بڑے ٹھنڈے انداز میں جوش و اشتعال کا اظہار کیے بغیر یونیورسٹی کی تعمیر و ترقی میں اپنی خدمات بیان کیں جن سے شاید ہی کسی کو انکار ہو، انہوں نے بعض اعتراضات کا جواب بھی دیا، تاہم ان کے جوابات سے ممبران پوری طرح مطمئن نہیں تھے، لیکن عشا کا وقت ہو گیا تھا اس لیے مزید بحث و گفتگو کے بغیر کارروائی ختم ہوگئی۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہندوستان کے مسلمانوں کی سب سے قیمتی متاع ہے لیکن یہ بدنصیبی ہے کہ وہ برابر حوادث کی زد میں اور داخلی انتشار کا شکار رہتی ہے، افسوس اس کا ہے کہ اکثر مسائل خود یونیورسٹی والوں ہی کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ انتظامیہ، طلبہ اور اساتذہ کے مسلسل تصادم اور ٹکراؤ سے تعلیمی نظام تو درہم برہم ہوتا ہی ہے ایسے عناصر کو مداخلت کا موقع بھی مل جاتا ہے جن کی دخل اندازی سے بدنما واقعات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اگر یونیورسٹی سے وابستہ لوگ اپنے فرائض نیک نیتی سے انجام دیں اور اپنے معمولی فائدوں کے لیے یونیورسٹی پر زد آنے دیں تو اسے سنگین نتائج کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مگر اس کے لیے سب کو صبر و ضبط اور تحمل سے کام لینا ہوگا ملت کے اس قیمتی سرمایہ کے محافظ و امین ہی اگر یونیورسٹی کے معاملات کی نزاکت و اہمیت کو محسوس نہ کریں اور معمولی باتوں کو اپنی انا اور وقار کا مسئلہ بنالیں تو

اس کی عظمت کی بازیافت کیسے ہو سکتی ہے، طلبہ جذبات کے تلاطم میں نہ بہیں، دوسروں کے بہکانے میں نہ آئیں، اساتذہ ان کو آلۂ کار بنا کر انتظامیہ کے لیے مشکلات نہ پیدا کریں اور انتظامیہ بھی ہیجان پیدا کرنے والے اقدامات سے باز رہے۔ جہاں اتنے لوگ ہوں گے وہاں مسائل پیدا ہوں گے مگر ان کو شماتت ہمسایہ اور یونیورسٹی کی تباہی کا موجب بننے سے پہلے ہی افہام و تفہیم سے حل کر لینا چاہیے۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے تک لکھنؤ علم و فن کا گہوارہ اور اردو زبان و ادب و صحافت کا مرکز تھا، لیکن انقلاب روزگار نے اس کی روایات و خصوصیات ایک ایک کر کے ختم کر دی ہیں۔ اردو کی خستہ حالی تو حد انتہا کو پہونچ چکی ہے۔ وہاں سے نکلنے والے اردو کے مقبول اور کثیر الاشاعت اخبار "قومی آواز" نے مدت تک موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار رہنے کے بعد کئی ماہ پہلے دم توڑ دیا۔ اس کی موجودگی ہی میں "صحافت" نے بال و پر نکالے اور اب ایک نئے اخبار "علی الصبح" نے اپنا جلوہ دکھایا ہے، ان کے معیار سے قطع نظر ان کی پرواز لکھنؤ ہی تک محدود رہے، کانپور کے سیاست اور پیغام بھی اب اسی کے حدود میں محصور ہوتے جا رہے ہیں، اتر پردیش کے بعض اور شہروں سے بھی جو گنے چنے اخبار نکل رہے ہیں وہ سب مقامی نوعیت کے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد لکھنؤ سے نکلنے والے رسالے ناپید ہوگئے، صدق جدید، کتاب اور فروغ اردو خدا جانے کس دنیا میں جا بسے، اردو اکادمی کا "اکادمی" تو مدت سے غائب ہے، مہینوں سے اس کا خبرنامہ بھی لاپتہ ہو گیا ہے، غالباً لے دے کے ریاستی حکومت کا ماہنامہ "نیا دور" اور مشہور مذہبی رسالہ "الفرقان" ہی باقی رہ گئے ہیں اب اسی مہینے سے روزنامہ "راشٹریہ سہارا" نکلا ہے۔ اس کو جو وسائل و ذرائع میسر ہیں اس کی بنا پر توقع کرنی چاہیے کہ اسے زندگی نصیب ہوگی۔

اردو والے اتر پردیش میں اردو کی خراب اور بدتر حالت کی ذمہ داری ریاستی حکومت پر عائد کر کے اپنا دامن بچا لیتے ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ اتر پردیش میں بننے والی تمام ریاستی حکومتوں نے اردو کی بیخ کنی کی لیکن اتر پردیش خصوصاً لکھنؤ جیسے اردو ادب و صحافت کے مرکز سے کسی اچھے اخبار کا نہ نکلنا اور جو نکل

رہے ہیں ان کا ریاست گیر حیثیت حاصل نہ کرنا کیا اردو والوں کے لیے باعث شرم نہیں؟ کیا اردو کے تمام ہمدردوں کی یہ ذمہ داری نہیں کہ وہ اس کے اسباب کا پتہ لگا کر ان کا تدارک کریں۔ اردو اخباروں کو منفعت سے زیادہ اردو کی خدمت و ترقی سے سروکار رکھنا چاہیے ایک اچھا اور معیاری اردو اخبار نکلنا اس سے بہتر ہے کہ ایک ہی شہر سے دو یا کئی اخبار نکلیں۔ اردو اخباروں کو اپنے ایجنٹوں سے بھی شکایت رہتی ہے کہ وہ وقت پر رقمیں نہیں ادا کرتے اور اکثر تو لے ہی ڈوبتے ہیں اردو سے عشق و محبت ہے تو اس کا حل بھی ڈھونڈنا ہوگا۔ اردو والوں کا ناقابل معافی جرم یہ ہے کہ نہ ان کو اردو تعلیم کے فروغ سے دلچسپی ہے اور نہ اسے اپنے گھروں میں رائج کرنے کی فکر۔ ان کی نئی نسلیں اردو سے ناآشنا ہوتی جارہی ہیں، ایسے میں کون اردو اخبار و رسالے اور کتابیں پڑھے گا۔ اگر ہر اردو والا ایک اردو اخبار کی خریداری اپنے اوپر لازم کرلے تو ایک کیا کئی اچھے اردو اخبار اترپردیش سے نکل سکتے ہیں۔

یہ سطریں زیر تحریر تھیں کہ عرعر (سعودی عرب) میں جشن جمہوریہ ہند کے موقع پر ہونے والے مشاعرہ کی رپورٹ موصول ہوئی، جس کو بزم احباب سخن عرعر کے صدر جناب حنیف ترین نے بھیجا ہے، یہاں "اردو منزل" کے نام سے ایک عمارت موسوم ہے، اسی میں مشاعرہ ہوا اور عرعر اور اس کے قرب و جوار میں آباد اردو سے تعلق رکھنے والے اہل ذوق کی کثیر تعداد شریک ہوئی اور شعراء کے کلام سے محظوظ ہوئی۔ ابھی ابھی ۸ فروری کا ہماری زبان ملا، اس میں ساجد علی ٹونکی صاحب نے لکھا ہے کہ جنوبی افریقہ کے مختلف صوبوں میں چھ لاکھ اردو بولنے والوں کی آبادی ہے، مسلمانوں کے تین بڑے دار العلوم میں ذریعہ تعلیم اردو ہے، مسلم اسکولوں کی ایک ایسوسی ایشن کے تحت تقریباً ۴۰ اسکول چل رہے ہیں اور بہت سے اسکولوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے، کتب خانوں میں اردو کے بڑے ذخیرے موجود ہیں۔ اردو کی نئی بستیوں کی خبریں خوش آیند سہی، لیکن چراغ تلے اندھیرا اور اردو کے مرکز اترپردیش اور دہلی میں اردو کی یہ زبوں حالی۔ آخر ع اس غم کی تلافی کیا ہوگی اس درد کا درماں کیا ہوگا۔

مقالات

خلافت ارض کے لیے علم کیمیا اور طبیعیات کی اہمیت

جدید صنعتی علوم کا ایک تعارف

از

مولانا محمد شہاب الدین ندوی*

اللہ تعالیٰ نے ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر خلیفہ بنا کر پیدا کیا اور خلافت ارض کا منصب سنبھالنے کے لیے انہیں علم الاشیاء سے نوازا، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا (بقرہ: ۳۰) اور اس نے آدم کو تمام چیزوں کے نام بتادیے۔

مفسرین نے تصریح کی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو دنیا بھر کی تمام چیزوں کے نام ہی نہیں بلکہ ان کے خواص و تاثیرات اور دینی و دنیوی منافع بھی بتادیے تھے۔ کیونکہ زمین کی خلافت کے لیے اس کی اشیاء سے واقفیت ضروری تھی تاکہ ہر چیز کا صحیح تعارف حاصل کرکے اس کا صحیح استعمال کیا جاسکے۔

علم آدم اور علم جدید اس موقع پر سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مفسرین کی تصریح کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کو موجودات عالم کے جو خواص و تاثیرات بتائے گئے تھے اور ان کے جن دینی و دنیوی منافع سے آگاہ کیا گیا تھا انہیں پر جدید سائنس کا دارومدار ہے۔ چنانچہ اس کا اور خاص کر طبیعیات اور علم کیمیا کا موضوع بحث مادی اشیاء کے خواص و تاثیرات

* ناظم فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ، بنگلور۔

یا ان کے منافع ہیں۔ ان خواص یا تاثیرات کو سائنس کی زبان میں فزیکل پراپرٹیز کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے آج جدید تجرباتی سائنس اشیائے عالم میں کھوج لگا کر جن خصوصیات کا پتہ چلا رہی ہے ان سب کا علم حضرت آدمؑ کو پہلے ہی دن عطا کر دیا گیا تھا، کیونکہ اشیائے عالم کی خصوصیات کا جاننا خلافت ارض کے نقطہ نظر سے نہایت درجہ اہم ہے۔ چنانچہ آج جو قوم اس علم میں برتر اور فائق ہے وہ زمین کی مادی خلافت پر فائز ہو کر اقوام عالم پر اپنی دھاک بٹھائے ہوئے ہے اور جو قوم اس علم میں تہی مایہ ہے وہ مادی و سیاسی میدان میں پس ماندہ ہو کر ترقی یافتہ قوموں کی حاشیہ بردار بنی ہوئی ہے۔ اسی لیے خلاق عالم نے تخلیق آدمؑ کے فوراً بعد ان کو تمام چیزوں کے نام اور ان کی خصوصیات کی تعلیم دے کے اس علم کی اہمیت جتا دی تھی۔ مزید براں اس علم سے متصف ہونے کی بنا پر فرشتوں پر آدمؑ کی فضیلت بھی ثابت کر دی تھی، تاکہ اہل اسلام اس علم سے کبھی غافل نہ رہیں۔ مگر یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ قرون وسطیٰ کے برعکس عصر جدید کے مسلمانوں نے اس علم کو پوری طرح فراموش کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ وہ آج بطور سزا دینی و دنیوی دونوں میدانوں میں مختلف قسم کے مصائب سے دوچار ہیں۔

لہذا تلافیٔ مافات کے لیے میدان خلافت میں آگے بڑھنا ضروری ہے، ورنہ خلافت کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ واضح رہے خلافت کے دو پہلو ہیں، ایک روحانی اور دوسرا مادی اور جب تک ان دونوں کو ملایا نہیں جائے گا خلافت نامکمل اور ناتمام رہے گی۔ ان میں تفریق کے باعث معاشرہ میں سخت ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ لہذا ان دونوں میں تطبیق اور توازن ضروری ہے تاکہ معاشرہ دینی و دنیوی دونوں قسم کی سعادتوں سے متمتع اور مالا مال ہو سکے۔ اسلام نے دین اور دنیا میں کبھی تفریق نہیں کی، بلکہ دونوں کی تحصیل پر زور دیا ہے۔ چنانچہ ہم کو یہ دعا سکھائی گئی ہے۔

ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ۔	اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں بھی بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی بھلائی عطا کر۔

یہ اسلام کی مثبت اور متوازن تعلیم ہے جو بے نقص اور بے عیب ہے اور وہ ہر دور میں اہل اسلام کو میدان خلافت میں آگے بڑھنے پر ابھارتی ہے تاکہ وہ اس میدان میں اپنی مہارتِ فن کے جوہر دکھا سکیں اور عصری تقاضوں کے مطابق تمدنی میدان میں ترقی کر کے اسلام اور مسلمانوں کا سر اونچا کر سکیں۔ اس اعتبار سے اسلام عزلت اور گوشہ نشینی کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ وہ میدان خلافت میں مثبت طور پر آگے بڑھنے کی دعوت دیتا ہے۔

بعض شبہات کا ازالہ تجرباتی علوم کی اہمیت پر روشنی ڈالنے اور خلافت ارض سے ان کا تعلق دکھانے سے پہلے ضروری ہے کہ سائنسی علوم کے تعلق سے آج کل بعض حلقوں میں جو غلط فہمیاں عمومی طور پر پائی جا رہی ہیں انہیں دور کر دیا جائے۔ کیونکہ بہت سے لوگ سائنسی علوم کو قابلِ حجت نہیں مانتے۔ ان کی غلط فہمی کی دو وجہیں ہیں: اول یہ کہ ان کی نظر میں یہ علوم تغیر پذیر ہیں جو کبھی ایک حالت پر قائم نہیں رہتے، بلکہ ان میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے اور دوم یہ کہ یہ علوم مادہ پرستانہ رجحانات کے حامل ہیں۔ لہذا ان سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہو سکتا۔ ہمارے نزدیک دونوں شکوک غلط اور بے بنیاد ہیں۔ جہاں تک پہلی غلط فہمی کا سوال ہے کہ سائنسی علوم میں برابر تبدیلی ہو رہی ہے تو یہ ایک قسم کا واہمہ ہے جو ان علوم اور ان کی معلومات کی اصلیت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، جس کی بنیاد نئے نئے حقائق و انکشافات کا ظہور ہے۔ چنانچہ مسلسل تجربات کی بنا پر اشیا کے نئے نئے خواص اور ان کے نئے نئے پہلو لگاتار ظاہر ہو رہے ہیں اور ہر علم و فن کے بارے میں پیہم اضافہ ہو رہا ہے۔ اس

بنا پر ایک عامی یہ سمجھتا ہے کہ یہ علوم برابر تبدیل ہورہے ہیں۔ حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ بنیادی معلومات جو پہلے سے ثابت شدہ ہیں ان میں کسی بھی قسم کی تبدیلی نہیں ہورہی ہے، بلکہ صرف وہ پہلو یا وہ معلومات ظاہر ہورہے ہیں جو پہلے مستور تھے۔ لہٰذا ان علوم میں جو تجرباتی ہوں۔ تبدیلی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس موضوع پر ہم نے ایک خاص کتاب لکھی ہے، لہٰذا اس موقع پر اتنی ہی تفصیل پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ سائنسی علوم مادہ پرستی کے رجحانات کے حامل ہیں تو یہ بھی ایک بہت بڑی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ خالص تجرباتی علوم میں مادہ پرستانہ رجحانات کا کوئی شائبہ تک نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اپنی اصلیت کے اعتبار سے اسرار فطرت کی نقاب کشائی کرنے والے اور مظاہر فطرت میں خلاق عالم کی جانب سے ودیعت شدہ بھیدوں اور تخلیقی رازوں کو بے نقاب کرنے والے اور ان اسرار وحقایق کو جو باری تعالیٰ کی توحید اور اس کی ربوبیت پر دلالت کرنے اور "آیات الٰہی" یعنی خدائی نشانیوں کو نمایاں کرنے والے ہیں، جن سے مادہ پرستانہ رجحانات اور گمراہ کن فلسفوں کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ یہ ایک وسیع موضوع ہے جو علمائے متکلمین کے ساتھ مخصوص ہے۔ لہٰذا اس مختصر مضمون میں اس پر تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں ہے۔

مادہ پرستانہ رجحانات کی حقیقت اس ساری تفصیل کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ جدید علوم و مسائل میں مادہ پرستانہ نظریات وخیالات ضرور پائے جاتے ہیں، جو مادہ پرستوں کی خواہشات اور ان کی تحریکوں کا نتیجہ ہیں، مگر ان نظریات یا فلسفیانہ رجحانات کی تجرباتی نقطۂ نظر سے کوئی اساس نہیں ہے بلکہ یہ نظریات اور فلسفے تجرباتی علوم اور ان کے مباحث میں اس طرح سمو دیے گئے ہیں یا ان پر سائنسی علوم کا "لیبل" اس طرح چسپاں کردیا گیا ہے کہ ایک عامی شخص کو اکثر وبیشتر دھوکا ہوجاتا ہے اور وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ علوم گویا کہ بذات خود

مادہ پرستانہ ہیں۔ حالانکہ ان دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں مصری عالم محمد متولی شعراوی نے ان دونوں چیزوں کا تجزیہ کرتے ہوئے بہت اچھی بات کہی ہے جو یہ ہے:

"علم انسانی دو بنیادی چیزوں پر مشتمل ہے: ایک تو مادی علم ہے جو خالص تجربہ کے تابع ہے اور جس میں انسانی خواہش کا کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ علم صرف مادہ سے بحث کرتا ہے اور اس پر معمل (لیبوریٹری) میں تجربہ کیا جاسکتا ہے۔ اس میں ہوائے نفس کا کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ وہی علم ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کرتے ہوئے اس میں اجتہاد کرنے کا مطالبہ کیا اور وعدہ کیا ہے کہ صحیفہ فطرت میں موجود اپنی نشانیاں ان لوگوں پر منکشف کردے گا جو اس میدان میں کھوج کررہے ہوں اور تجربات میں مصروف ہوں اور اس سلسلے میں دوسرا علم وہ ہے جس میں خواہشات نفسانی کا گذر ہے، مگر وہ تجربہ گاہ میں داخل نہیں ہوسکتا اور نہ اس پر کوئی تجربہ کرنا ممکن ہے۔ مثلاً فلسفیانہ اور سیاسی نظریات اور ہر وہ چیز جو لیبوریٹری میں تجربہ کرنے کے قابل نہ ہو۔ چنانچہ اس قسم کے علم میں خواہشات مختلف ہوسکتی ہیں اور ان میں نزاع بھی ہوسکتا ہے اور یہ نزاع اور تصادم قیامت تک جاری رہے گا۔ کیونکہ یہ علم خالص مادی اور موضوعی اساس پر قائم نہیں ہے۔"[1]

تجرباتی علوم کی حقیقت اس موقع پر جدید سائنسی علوم کے بعض دیگر پہلوؤں پر بھی ایک نظر ڈال لینا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ ان علوم کے سلسلے میں جو غلط فہمیاں عمومی طور پر پائی جاتی ہیں وہ دور ہوجائیں۔ اگر جدید تجرباتی علوم کا ہم حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ ان علوم میں اپنی اصل کے اعتبار سے مادہ پرستانہ نظریات ورجحانات کا کوئی شائبہ تک

نہیں ہے بلکہ وہ اپنی طبیعت کے اعتبار سے ایک "غیر جانبدارانہ" رجحان کے حامل نظر آتے ہیں یعنی وہ صرف نظام فطرت کے حقائق منکشف کرتے ہیں، جن میں نہ تو مادیت ہوتی ہے اور نہ روحانیت۔ مگر مادہ پرست ان آفاقی حقائق کو اُچک لیتے ہیں اور انہیں اپنے انحرافی رجحانات کے مطابق بناکر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے ایک عامی کو دھوکا ہوجاتا ہے کہ یہ پورے آفاقی حقائق بذات خود مادہ پرستانہ ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں مشہور مغربی فاضل محمد اسد (سابق لیوپولڈ ویس) نے اس حقیقت کا تجزیہ اس طرح کیا ہے۔

" علم بجائے خود نہ تو مغربی ہے اور نہ مشرقی۔ بلکہ وہ اسی طرح عام ہے جس طرح کہ طبیعی حقائق عام ہیں۔ البتہ انہیں جس نقطۂ نظر سے دیکھا اور پیش کیا جاتا ہے اسی طرح وہ قوموں کے ثقافتی مزاج کے مطابق مختلف ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ حیاتیات اپنے حیاتیاتی علم ہونے کے اعتبار سے اور اسی طرح طبیعیات اپنے علم طبیعی ہونے کے اعتبار سے نہ تو پوری طرح مادی ہیں اور نہ روحانی۔ بلکہ وہ حقائق کے ملاحظہ اور ان کے جمع و تطبیق اور ان سے معقولی ضوابط وضع کیے جانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب رہے وہ استقرائی نتائج جو ہم ان علوم کے فلسفوں کے طور پر مستنبط کرتے ہیں تو وہ صرف حقائق اور مشاہدات پر مبنی ہوتے ہیں لیکن وہ بہت بڑی حد تک ہمارے اصل مزاج اور ہمارے عقلی موقف سے ضرور متاثر ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں جرمن فلسفی کانٹ کا قول ہے کہ "یہ بات عجیب سی لگتی ہے مگر بہر حال وہ ایک حقیقت ہے کہ ہماری عقل عالم فطرت سے نتائج اخذ نہیں کرتی لیکن وہ انہیں اس کی طرف منسوب کرتی ہے۔" غرض اس سلسلے میں اپنا تنہا ذاتی نقطۂ نظر ہی ہے جو اپنا اثر ڈالتا ہے اور اشیاء کے ظاہر کو بدل دیتا ہے۔ یہی حال دیگر علوم کا بھی ہے جو اپنی ذات میں نہ تو مادی ہیں اور نہ روحانی بلکہ وہ اپنے خاص عقلی استعداد کے مطابق اس طرف یا اس طرف

ہوسکتے ہیں۔[۱]

اس موقع پر یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ تجرباتی علوم موجودات عالم کی کامل تشریح و توجیہ نہیں کرتے بلکہ صرف ان کے ظاہری رُخ کی ہی نقاب کشائی کرسکتے ہیں جو اس بات کا اشارہ ہے کہ ان کے پیچھے حقائق و اسرار کا ایک اور سلسلہ موجود ہے جو دراصل مابعد الطبیعیات سے جڑا ہوا ہے اور وہ اصول دین کی تصدیق و تائید کرنے کے موقف میں ہے اور جہاں تک علم جدید یا سائنس کی محدودیت کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں مشہور فلسفی مصنف جوڈ (C.E.M. JOAD) تحریر کرتا ہے کہ: سائنس ہر چیز کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہنے کے قابل تو ہے مگر وہ کسی بھی چیز کی مکمل صداقت بیان کرنے کے موقف میں نہیں ہے۔

Science is competent to tell us something ABOUT ever ything; but it can not tell us the hole truth about any thing

مادیت کی شکست و ریخت

مظاہر عالم کی اس تشریح و توجیہ میں سائنسی علوم کی محدودیت اور ان کی عدم کفایت کے باوجود مادہ پرستانہ فلسفے ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ مظاہر کائنات کی "ظاہری شہادت" و گواہی کو اپنے کھاتے میں شامل کرلیں اور انہیں زبردستی مادیت کا جامہ پہنادیں۔ لیکن پچھلی دو صدیوں کے برعکس اب بیسویں صدی میں مادیت و میکانیت نے دم توڑ دیا ہے اور جدید طبیعی اکتشافات اور خاص کر کوانٹم نظریات نے مادہ پرستی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کردیا ہے۔ چنانچہ مادیت کی اس شکست فاش کے بعد اب سائنس اور مذہب میں ملاپ کا راستہ صاف ہوگیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اب جدید سائنسی اکتشافات کے ذریعہ اصول دین کی صداقت پر بہتر سے بہتر انداز میں استدلال کیا جاسکتا ہے اور اسلامی تعلیمات کی حقانیت نظامِ فطرت کے دلائل کے ذریعہ ثابت کی جاسکتی ہے۔

اس اعتبار سے اب مادیت کا دور ختم ہوچکا ہے اور وہ ایک داستان پارینہ بن چکی ہے، جس نے انیسویں اور بیسویں صدی میں غلبہ حاصل کر لیا تھا لیکن صورت حال یہ ہے کہ مادہ پرست علمی میدان میں شکست کھا چکنے کے باوجود اب تک مظاہر کائنات کی مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے تشریح و توجیہ کرنے ہی میں لگے ہوئے ہیں اور وہ اس سلسلے میں پرانے اور فرسودہ نظریات ہی کا سہارا لے رہے ہیں اور پرانے راگ ہی اب تک الاپ رہے ہیں۔

بہرحال جدید ترین علمی اکتشافات کی بدولت آج مذہب اور جدید سائنس میں تطبیق کا کام بہت آسان ہوگیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں جوڈ تحریر کرتا ہے کہ: وہ خلیج جو انیسویں صدی میں سائنس اور مذہب کے درمیان حائل تھی وہ اب صحیح طریقے سے پاٹ دیے جانے کے قابل بن گئی ہے۔

The ninteen-century gulf between science and religion is in a fair way to being bridged .

سائنسی علوم کی اسلامیت اس اعتبار سے مغربی علوم کے دو پہلو ہیں: ایک پہلو وہ ہے جو موجودات عالم کے مظہر اور ان کے حقائق کی نمایندگی کرتا ہے اور یہی وہ پہلو ہے جو تجرباتی علم کے تابع ہونے کی حیثیت سے علمی و تمدنی اعتبار سے ہمارے لیے ضروری ہے اور دوسرا پہلو وہ ہے جو انحرافی رجحانات اور مادہ پرستانہ نظریات و میلانات کا مظہر ہونے کی بنا پر دین اور روحانیت کے لیے مضر ہے۔ لہذا ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ بہرحال قسم اول سے اصول دین (دینی عقائد) کی تصدیق و تائید ہوتی ہے اور وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے روح قرآنی کے مطابق ہے اور ہمیشہ مادہ پرستانہ رجحانات کی تردید کرتا ہے اسی لیے ارشاد باری ہے:

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ — اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے

وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ۔ (ذاریات ۲۰-۲۱) — (بہت سی) نشانیاں موجود ہیں اور خود تمہارے نفوس میں بھی کیا تم کو نظر نہیں آتا۔

لہذا ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم نظام فطرت میں خلاق عالم کے ان ودیعت شدہ حقائق و معارف کا جائزہ لے کر علمی دلائل و براہین کی تدوین کریں جو مادیت ولادینیت کو خود ان کی اپنی تحقیقات کی رو سے شکست دے سکتے ہوں۔ یہی قرآن عظیم کا اقتضا ہے اور اس لحاظ سے یہ ایک بالکل انوکھی بات ہے کہ آج مادیت خود اپنی شکست و ہزیمت کی راہ میں مصروف رہ کر کائناتی حقائق کی تفتیش و تحقیق کر رہی ہے اور یہ خلاق عالم کی عجیب و غریب حکمت و منصوبہ بندی ہے۔

غرض اس تطبیق کے ذریعہ آج ہم سائنسی علوم کو مشرف باسلام کرکے ان میں سرایت کردہ کھوٹ یعنی مادہ پرستانہ رجحانات کو بھی دور کر سکتے ہیں اور اس اعتبار سے آج سائنس اور اس کے تمام علوم دین ابدی کے خادم اور حاشیہ بردار نظر آرہے ہیں۔ لہذا علمائے اسلام پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اسلامی حقائق اور جدید حقائق و اکتشافات کا جائزہ لے کر سائنسی علوم میں سرایت کردہ شر و فساد کو دور کرکے اسلامی نقطۂ نظر سے ایک طرف ان کی تطہیر کریں تو دوسری طرف جدید مادہ پرستانہ تحریکوں کا علمی و استدلالی میدان میں مقابلہ کرکے انہیں شکست فاش سے دوچار کریں اور یہ مقاصد اسی وقت پورے ہو سکتے ہیں جب کہ ہم پوری سنجیدگی کے ساتھ سائنسی علوم میں مہارت حاصل کرکے ان کی باریکیوں سے مکمل واقفیت حاصل کرلیں۔ اگر ہم نے یہ عمل گزشتہ ایک یا نصف صدی پہلے شروع کیا ہوتا تو مادیت ولادینیت کا کبھی خاتمہ ہوچکا ہوتا اور اس کے نتیجے میں دینی اقدار کی بحالی ہوچکی ہوتی۔ چنانچہ ان مادہ پرستانہ تحریکوں نے اب تک نوع انسانی کو مختلف قسم کے فتنوں میں مبتلا کر رکھا ہے اور دینی و اخلاقی قدروں کو مسلسل پامال کر رہی ہیں، لہذا الحاد و لادینیت کے خاتمے کے لیے جو اس وقت علمی

اعتبار سے جانکنی کے عالم میں ہے ایک بہت بڑے علمی جہاد کی ضرورت ہے جو قرآن عظیم کی رہنمائی
میں بخوبی انجام دیا جاسکتا ہے اور اس مقصد عظیم کے لیے آج زمین پوری ساز گار نظر آتی ہے۔
لہذا اہل اسلام کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس میدان میں پیش قدمی کے لیے کمربستہ ہوجائیں ورنہ
دین الٰہی کو دوبارہ عروج حاصل نہیں ہوسکتا۔ یہ اہل اسلام کے لیے ایک فرض کفایہ ہے۔

تجرباتی علوم کی اہمیت یہ تجرباتی علوم کی علمی واستدلالی حیثیت سے اہمیت وافادیت
کا ایک مختصر جائزہ تھا، جو احیائے علم اور احیائے دین وشریعت کے لیے ضروری ہیں۔ اب رہے
ان علوم کے ذریعہ صنعت وحرفت اور ٹکنالوجی کے میدان میں حاصل ہونے والے منافع
تو اس وقت اسی موضوع پر تفصیلی بحث مطلوب ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تجرباتی علوم کے اتنے
سارے فوائد ہیں جو شمار سے بھی باہر ہیں۔ اسی لیے اسلام نے ان علوم میں ترقی کرکے مادی اشیاء
میں ودیعت شدہ خدائی نعمتوں سے استفادہ کی بہت زیادہ تاکید کی ہے اور نوع انسانی کو موجودات
عالم کی تسخیر پر ابھارتے ہوئے استقرائی حیثیت سے ان کے نظاموں کا جائزہ لینے پر متعدد
طریقوں سے ابھارا ہے۔ چنانچہ اسلام کی اسی تاکید اور دعوت فکر کے باعث اسلامی عہد میں
تجرباتی علوم کا نشوونما ہوا اور آج یہ علوم اوج کمال پر پہنچے ہوئے ہیں۔

بہرحال تجرباتی علوم جس طرح علمی واستدلالی میدان میں قابل حجت ہیں اسی طرح وہ صنعت
وحرفت اور ٹکنالوجی کے میدان میں بھی قوموں کو آگے بڑھانے میں معین ومددگار ہیں اور انہی علوم
کے ذریعہ میدان خلافت کو سر کیا جاسکتا ہے۔ اس حیثیت سے ان علوم کی بہت زیادہ اہمیت
ہے۔ چنانچہ آج قوموں کے عروج وزوال اور ان کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں انہی علوم کی کارفرمائی
نظر آتی ہے اور جو قومیں آج ان علوم سے آراستہ ہیں وہ عرش خلافت پر متمکن ہوچکی ہیں۔ لہذا
ان علوم کی اہمیت کو کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ دینی ودنیوی دونوں

نقطہ ہائے نظر سے تجرباتی علوم کے بے شمار فوائد ہیں اور انہی علوم کی بدولت صنعت وٹکنالوجی کے
میدان میں زبردست ترقی ممکن ہوسکی ہے اور یہی وہ علوم ہیں جو مظاہر عالم میں مستور شدہ منافع
کے حصول کو ممکن بناتے ہیں اور ان میں پوشیدہ قوتوں جیسے برق وبھاپ اور جوہری توانائی،
شمسی توانائی اور اشعاعی قوت پر قابو پانے میں مدد دیتے ہیں۔ چنانچہ مادہ میں مستور یہ پوشیدہ
قوتیں اور توانائیاں جن سے آج ہزاروں قسم کے کام لیے جارہے ہیں اور انہیں مسخر کرکے موجودہ
تمدن کو ایک بالکل نیا روپ دے دیا گیا ہے، سب کے سب تجرباتی علوم اور خاص کر طبیعیات
(فزکس) اور علم کیمیا (کیمسٹری) کی کارفرمائیاں ہیں۔ چنانچہ یہ دو علوم اشیائے عالم کی تسخیر اور
ان کے مادی منافع کی تحصیل میں بنیادی اور زبردست رول ادا کرتے ہیں۔ بلکہ حق بات تو
یہ ہے کہ طبیعیات اور کیمیا مادی نقطۂ نظر سے خلافت ارض کی دو چابیاں ہیں جن کے ذریعہ اس
میدان کو سر کیا جاسکتا ہے اور اس لحاظ سے آج جو قوم ان علوم سے بے بہرہ ہے وہ خلافت کے
اسٹیج سے معزول قرار دی جاچکی اور باہر کردی گئی ہے۔

غرض تجرباتی علوم کی بھی کثرت مباحث کے باعث بہت سی شاخیں یا ذیلی علوم وجود میں
آچکے ہیں اور دن بدن نئے نئے علوم کا اضافہ ہورہا ہے اور یہ ایک ایسا سمندر ہے جس کے کناروں
کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ اسی لیے ہم نے اس مختصر جائزہ میں بحث ومباحثہ کے لیے صرف علم کیمیا اور
طبیعیات کو منتخب کیا ہے تاکہ ان دو علوم کی اہمیت اہل اسلام کے ذہنوں میں راسخ ہوجائے
جن کا خلافت ارض سے بہت گہرا تعلق ہے۔ لہذا اب آگے ان دونوں علوم کا تعارف کراتے ہوئے
جدید صنعت وٹکنالوجی سے ان کا تعلق دکھایا جائے گا۔

طبیعیات پر ایک نظر طبیعیات اور کیمیا ہی دو علوم ہیں جن پر تجرباتی وصنعتی علوم اور
جدید ٹکنالوجی کا دارومدار ہے۔ چنانچہ کوئی بھی نئی ایجاد یا اختراع یا علمی اکتشاف ان دونوں کی

مدد کے بغیر واقع نہیں ہوسکتا پھر ان دونوں میں بھی طبیعیات کو کیمیا پر نسبتاً زیادہ فضیلت حاصل ہے کیونکہ اس نے آج علمی دنیا میں تمام طبیعی علوم کا احاطہ کر رکھا ہے اور اس بنا پر گویا کہ وہ طبیعی علوم کا سرتاج قرار پاچکا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک طبیعیات داں گویا ہے:

فزکس یا طبیعیات ہمیشہ سے سب سے افضل و برتر علم رہا ہے۔ مادہ اور توانائی کا (فطری) برتاؤ جو فزکس کا موضوع ہے، اُس کے دائرے میں دنیا بھر کی تمام (طبیعی) سرگرمیاں آجاتی ہیں۔ چنانچہ اس وقت فلکیات، کیمیا، ارضیات حتیٰ کہ حیاتیات تک تمام کے تمام علوم طبیعیات کی کالونیاں بن چکی ہیں اور اس کے علاوہ طبیعیات کے اکتشافات کا اطلاق تمام تیارشدہ کاوشوں میں پایا گیا ہے خواہ وہ مد و جزر کا حساب ہو یا ٹیلی ویژن کی تیاری ہو یا جوہری توانائی کا اخراج ہو۔ غرض آج طبیعیات نے پورے عالم میں ایک شور و شغب برپا کر دیا ہے، خواہ وہ اچھائی کے لیے ہو یا برائی کے لیے۔

Physics was always the master-science . The behaviour of matter and energy which was the THAME , underlay all actions in the world , In time astronomy , chemistry , geology and even biology become extentions of physics . More over , its discoveries found ready applications , whether calculating the tides ,creating television , releasing nuclear energy . For better or worse, physics made a noise in the world .(۵)

ایک دوسرا ماہر سائنس داں کہتا ہے کہ: حقیقت یہ ہے کہ تجرباتی علوم جیسے کیمیا، فلکیات اور ارضیات وغیرہ جب ۱۸۵۰ء سے پہلے مستقل علوم بن گئے تو طبیعیات ان علوم کا مرکز ہونے کی حیثیت سے باقی رہی۔ کیونکہ دیگر علوم میں اس کی حیثیت مرکزی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ طبیعیات کی مفاہمت دیگر علوم میں ضروری ہے۔

Long before 1850. chemistry , astronomy , geology and other such studies split off into indipendent , the core that was left came to be known as physics . Because of the central importance in the science. An understanding of physics is required in many other desciplines. (۶)

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں طبیعیات کی تعریف اس طرح کی گئی ہے: طبیعیات وہ بنیادی علم ہے جو مادہ اور توانائی اور ان دونوں کے باہمی تعامل کے بارے میں بحث کرتا ہے اور مادہ کی ساخت کے بارے میں بنیادی سوالات اور اس کے اندر پائے جانے والے عنصری اجزا کے باہمی تعاملات کا مطالبہ کرتا ہے، جو تجرباتی طور پر قابل بحث ہوسکتے ہیں۔[۶]

اس بحث سے بخوبی واضح ہوگیا کہ طبیعیات ایک ہمہ گیر سائنس ہے جس کے بہت لمبے ہاتھ ہیں۔ چنانچہ اس علم نے آج ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کا احاطہ کر رکھا ہے۔ گھروں میں، دفتروں میں، بازاروں میں، ہسپتالوں میں اور جنگی میدانوں میں استعمال کی جانے والی کوئی چیز ایسی نہیں رہ گئی ہے جس میں طبیعیات کا عمل دخل نہ رہ گیا ہو۔ اسی علم کی بدولت آج بجلی، بھاپ، اشعاعی قوت اور جوہری توانائی وغیرہ کا استحصال ممکن ہوسکا ہے اور یہ وہ طاقتیں ہیں جو ہمارے گھروں، سڑکوں اور بازاروں کو منور کر رہی ہیں، موٹروں، ریلوں اور ہوائی جہازوں کو چلا رہی ہیں اور بڑی بڑی مشینوں کو حرکت میں لاکر کارخانوں کو متحرک رکھنے میں بنیادی رول ادا کر رہی ہیں۔ نیز انہی طاقتوں کی بدولت آج انسان خلاؤں میں تانک جھانک کر رہا ہے اور چاند کی تسخیر کر کے مریخ اور مشتری پر ڈورے ڈال رہا ہے۔ اسی طرح آج برقی مقناطیسی لہریں پیدا کر کے مواصلات کی دنیا میں ایک عظیم انقلاب لاچکا ہے۔ چنانچہ لاسلکی پیغامات کے ذریعہ اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ انسان دنیا کے کسی بھی مقام میں بیٹھ کر دور دراز کے شہروں ہی سے نہیں

بلکہ چاند اور مریخ سے بھی رابطہ قائم کر سکتا ہے اور وہاں کے حالات کا بچشم دید مطالعہ و مشاہدہ کر سکتا ہے، جس طرح کہ کمپیوٹر انٹرنیٹ کے ذریعہ بذریعہ "ای میل" اپنے پیغامات ایک سکنڈ سے بھی کم وقفے میں دنیا بھر کے تمام کمپیوٹروں کو بیک وقت پہنچا سکتا ہے۔ نیز کمپیوٹر انٹرنیٹ کی مدد سے دنیا بھر کے اخبارات کا (جو اس سروس سے منسلک ہوں) اور اسی طرح دنیا بھر کی لائبریریوں میں موجود کتابوں کا گھر بیٹھے مطالعہ کر سکتا ہے۔ غرض سائنس اور ٹکنالوجی کے یہ تمام محیر العقول کارنامے آج علم طبیعیات ہی کی بدولت ممکن ہو سکے ہیں جو اس کوچے سے ناواقف لوگوں کو جادو کی نگری معلوم ہوتے ہیں۔

کثرت مباحث کی وجہ سے اس علم کی بے شمار شاخیں وجود میں آچکی ہیں۔ چنانچہ اس موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان پر ایک نظر ڈال لی جائے تاکہ طبیعیات کی کارفرمائیوں کا ایک خاکہ ہمارے ذہن میں آجائے۔ اس علم کی شاخیں اور مختصر تعریفیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ صوتیات (Acoustics) یہ علم آواز کے وقوع اور اس کی خصوصیات سے بحث کرتا ہے۔

۲۔ جوہری طبیعیات (Atomic Physics) اس علم میں جوہر، اس کی خصوصیات اور اس کے عمل سے بحث کی جاتی ہے۔

۳۔ حیاتیاتی طبیعیات (Biophysics) اس علم کے تحت زندہ اشیا پر اثر انداز ہونے والے طبیعی عوامل و اثرات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

۴۔ کریوجینکس (Cryogenics) اس کے تحت اقل ترین درجۂ حرارت کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

۵۔ کہربائی حرکیات (Electrodynamics) اس میں بجلی اور مقناطیس کی قوتوں کے

درمیان پائے جانے والے اتصال کی تحلیل کی جاتی ہے۔

۶۔ سیالی طبیعیات (Fluid Physics) اس کا تعلق سیالی اشیا اور گیسوں کے عمل اور ان کی حرکات سے ہے۔

۷۔ ارضیاتی طبیعیات (Geophysics) اس میں طبیعیاتی قوانین کے ذریعہ زمین، ہوا اور پانی کے احوال کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

۸۔ طبی طبیعیات (Helth Physics) اس کے تحت ان لوگوں کی حفاظت کا سامان کیا جاتا ہے جو اشعاعی دائرہ میں کام کرتے ہیں۔

۹۔ ریاضیاتی طبیعیات (Mathematical Physics) اس میں ان ریاضیاتی نظاموں کا مطالعہ کیا جاتا ہے جو طبیعیاتی مظاہر میں پائے جاتے ہیں۔

۱۰۔ میکانیات (Mechanics) اس علم کے تحت ان چیزوں کے عمل اور ان کے نظاموں کا جائزہ لیا جاتا ہے جو مختلف قوتوں کے رد عمل کے طور پہ کام کرتے ہیں۔

۱۱۔ سالماتی طبیعیات (Molecular Physics) اس میں سالمات کی ہیئت، ان کے خصائص اور ان کے برتاؤ کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔

۱۲۔ جوہری طبیعیات (Nuclear Physics) کا موضوع بحث جوہری مرکز کی ساخت اور اس کی خصوصیات ہے، جس کی رو سے جوہری تعامل اور اس کے رد عمل کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

۱۳۔ بصریات (Optics) اس میں روشنی کی ساخت اور اس کے عمل کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

۱۴۔ ذراتی طبیعیات (Particle Physics) اس علم کے تحت بنیادی ذرات

(Elementry Particles) کے عمل اور ان کی خصوصیات کی تحلیل کی جاتی ہے۔

۱۵۔ پلازما طبیعیات (Plasma Physics) اس علم میں اونچے درجے کی رواں ساز گیسوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

۱۶۔ کوانٹم طبیعیات (Quantam Physics) اس میں کوانٹم نظریہ کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا جاتا ہے جو مادہ اور کہربائی ومقناطیسی اشعاع زنی کے باہمی تعامل سے متعلق ہیں۔

۱۷۔ ٹھوس مادوں کی طبیعیات (Solid-State Physics) اس کے تحت ٹھوس اشیاء میں پائے جانے والے طبیعی خواص کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

۱۸۔ حرکیات حرارت (Thermodynamics) اس علم میں حرارت اور طاقت کی دوسری شکلوں اور طاقت کو ایک شکل سے دوسری شکل میں تبدیل کرنے پر بحث کی جاتی ہے[۸]۔

روایتی طبیعیات کا دائرۂ علم مقادیر، میکانیات، حرارت، بجلی، مقناطیس، بصریات اور آواز پر مشتمل تھا لیکن اب جدید طبیعیات میں نظریہ اضافیت اور کوانٹم میکانیات کا بھی اضافہ ہو گیا ہے[۹] اور موجودہ دور میں کوانٹم میکانیات نے بہت زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے۔

واضح رہے یہ تمام طبیعی قوانین وضوابط صحیفۂ فطرت میں پائے جانے والے خدائی ضوابط ہیں جو ازل سے لے کر اب تک برابر جاری وساری ہیں اور ان کا سلسلہ قیامت تک اسی طرح بغیر کسی انقطاع کے جاری رہے گا اور ان قوانین میں انسانی کوششوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہے بلکہ انسان صرف اتنا ہی کرتا ہے کہ وہ ان قوانین قدرت بلکہ زیادہ صحیح معنوں میں "قوانین ربوبیت" کی تحقیق وتفتیش کرکے اپنی عملی زندگی میں ان سے فائدہ اٹھاتا ہے اور تمدن کو ایک نیا رخ دے دیتا ہے۔ چنانچہ ان قوانین کو کھوج نکالنے پر دو قسم کے فوائد ہمارے سامنے آتے ہیں: ایک تو مظاہر عالم کی ساخت اور ان کی خصوصیات کا علم جو علمی واستدلالی حیثیت سے توحید باری اور اس کی

ابدی صفات کا اثبات کرنے والا ہے اور دوسرے مادی اشیاء کے نظاموں میں پائے جانے والے مادی فوائد سے استفادہ۔ یہی وہ "اسماء ومسمیات" یا چیزوں کے خواص وتاثیرات اور دینی ودنیوی فوائد ہیں جن کا علم اللہ تعالیٰ نے ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام کو پہلے ہی دن عطا کر دیا تھا اور یہی وہ علم ہے جس پر خلافت ارض کا دار ومدار ہے جیسا کہ تفصیلات پچھلے صفحات میں گزر چکی ہیں۔

علم کیمیا پر ایک نظر طبیعیات کے اس مختصر جائزہ کے بعد اب علم کیمیا کی اہمیت وافادیت پر ایک نظر ڈالی جاتی ہے اور قدیم وجدید کیمیا کا فرق واضح کیا جاتا ہے۔ چنانچہ دور قدیم میں کیمیا کا اہم ترین مقصد سستی دھاتوں کو سونے یا چاندی میں تبدیل کرنا تھا۔ جب کہ اس کے برعکس آج کیمیا کا اہم ترین مقصد چیزوں کی شکل وصورت بدلنا اور ایک چیز کو دوسری چیز میں تبدیل کرنا نیز مادی اشیاء کے خواص وتاثیرات کا مطالعہ کرکے ان میں ودیعت شدہ پوشیدہ قوتوں سے استفادہ ہے۔

علم کیمیا کی تعریف: روئے زمین پر پائی جانے والی مختلف اشیاء کے طبیعی خواص وتاثیرات اور مختلف حالتوں میں ان کے اعمال وافعال کا مطالعہ وجائزہ[۱۰]۔

دوسری تعریف: کیمیا کیا ہے؟ ہم اس کی تعریف اس طرح کر سکتے ہیں کہ وہ مادوں (مادی اشیاء) کی خصوصیات، ان کے تعاملات اور ان کو دیگر شکلوں میں تبدیل کرنے کا نام ہے۔

What is chemistry? We can define it as the study of properties of substances and of the reactions that transform them into other substances.[۱۱]

ایک اور تعریف: کیمیا ان مادوں کا علم ہے جو ہم کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، جیسے ہوا، پانی، چٹانیں، درخت اور حیوانی مادے۔ کیمیا کا زیادہ تر تعلق انہی مادوں اور ان کے تعاملات سے ہے۔ تاہم اس علم کا تعلق اس مقداری پہلو سے بھی ہے جو ان چیزوں کے اوزان اور ان کے

خواص سے ہے۔ چنانچہ اشیاء کا یہ مقداری منظر جدید کیمیا میں ہمیشہ سے اپنا پارٹ ادا کرتا رہا ہے اور ادا کرتا رہے گا۔

Chemistry is the science of the materials around us, such as air, water, rocks and plant and animal substances. Much of chemistry involves describing these materials and the changes they undergo. However, chemistry also has a quantitative side concerned with measuring and calculating the characteristies of materials. This quantitative aspects has played and continues to play an important roll in the modern chemistry.[12]

ان تعریفات کے ذریعہ واضح ہو گیا کہ کیمیا اشیاء کے باہمی تعاملات و تحولات اور ان کے خصائص کا علم ہے اور یہ علم اپنی جدید شکل و ہیئت میں اٹھارویں صدی میں ظہور پذیر ہوا جب کہ علم و تحقیق کے میدان میں ترازو کا استعمال باقاعدگی کے ساتھ ایک آلہ تحقیق کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔

Modern Chemistry emerged in the eighteen century, when the balance began to be used systematically as a t in research.[13]

چنانچہ آج کل ایسے جدید ترین اور نازک و حساس ترازو ایجاد کیے جا چکے ہیں جو کسی بھی چیز کا وزن حد درجہ صحت کے ساتھ معلوم کر سکتے ہیں، حتیٰ کہ اب ایٹمی ذرات اور ان کے اندرونی اجزا تک کا وزن معلوم کر لیا گیا ہے۔ حالانکہ ایٹم اتنی رتی سی چیز ہے کہ خالی آنکھ کو نظر آنے والے ایک چھوٹے سے ذرہ میں کم از کم ایک ارب ایٹم ہو سکتے ہیں۔ آج کل سائنسی لیبورٹریاں ایسے جدید ترین آلات اور حیرت انگیز مشینوں سے لیس ہیں کہ اب سے پچاس برس پہلے تک بھی ان کا

کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جدید سائنس داں نئے نئے آلات و ادوات اور نئے نئے وسائل کے ذریعہ مادی اشیاء کے خصائص و اسرار کا کھوج لگا کر اشیاء و عناصر کی قلب ماہیت کر رہے ہیں اور پوری ماہیت کے ساتھ ایک چیز کو دوسری میں تبدیل کر رہے ہیں اور ان میں موجود طاقتوں پر قابو پا کر نئی نئی ایجادات کر رہے ہیں، جیسے برق و بھاپ، شعاع زنی اور جوہری طاقت وغیرہ۔ ان ایجادات و اختراعات نے آج ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کو پوری طرح گھیر رکھا ہے اور زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں رہ گیا ہے جو ان علوم اور ان کی کارفرمائیوں سے باہر ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ان نئے آلات و وسائل کے بغیر ایک دن بھی زندگی گزارنا ہمارے لیے مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہو گیا ہے۔

مراجع

[1] معجزۃ القرآن، محمد متولی شعراوی، ص ۱۵۸، قرص ایڈیشن ۱۴۰۷ھ [2] الاسلام علی مفترق الطرق، (اسلام ایٹ دی کراس روڈ کا عربی ترجمہ) ترجمہ از عمر فروخ، ص ۱-۲۷، مطبوعہ بیروت ۱۹۷۴ء۔

[3] Guide to Modern Thought , by C.E.M.Joad. P. 108, London

[4] Abid, P. 17

[5] The Key to the Universe , Nigel Carder, P. 14. London, 1977.

[6] Physics: Classical and modern, W. Edward Gettys, P. 1. New York, 1989.

[7] دیکھیے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا: ۱۴/۲۲۴ مطبوعہ ۱۹۸۳ء [8] دیکھیے دی ورلڈ بک انسائیکلوپیڈیا: ۱۵/۳۷۳، مطبوعہ لندن، ۱۹۹۶ء [9] دیکھیے فزکس: کلاسکل اینڈ ماڈرن، ص ۱، مطبوعہ لندن [10] دیکھیے ورلڈ بک انسائیکلوپیڈیا: ۳/۳۶۶، مطبوعہ لندن ۱۹۹۶ء۔

[11] Principles of modern Chemistry, Oxtoby, P. 1. Philodelphia. 1990

[12] General Chemistry, Ebbing, P. 3. Boston, 1990

[13] Abid. P. 4.

عیون الانباء فی طبقات الاطباء

از پروفیسر ڈاکٹر محمد طفیل، اسلام آباد۔

عیون الانباء فی طبقات الاطباء ابن ابی اصیبعہ کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے، وہ اس کا سبب تالیف بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"جو اہل علم طبقات الاطباء پر کام کر سکتے تھے ان کی کوئی جامع تالیف میری نظر سے نہیں گزری میں نے سوچا کہ ایک ایسی کتاب مدون کی جائے جس میں قدیم و جدید ممتاز اطباء کے احوال و آثار، ان کی دانش و تجربے کے اہم نکات و معارف بیان کیے جائیں، زمانی اعتبار سے ان کے طبقات کا تعارف کرایا جائے اور ان کے اقوال، حکایات، نادر واقعات درج کیے جائیں اور ان کی تالیف کے نام گنوائے جائیں"[1]

کتاب کو درج ذیل پندرہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے:

پہلا باب: علم طب کا آغاز۔ دوسرا باب: ابتدائی انسانی عہد کے اطباء کے طبقات۔ تیسرا باب: اسقلبیوس کی نسل کے یونانی اطباء کے طبقات۔ چوتھا باب: بقراط کے یونانی تلامذہ کے طبقات پانچواں باب: عہد جالینوس کے اطباء۔ چھٹا باب: اسکندریہ کے اطباء اور اس عہد کے نصرانی اطباء ساتواں باب: ابتدائی اسلامی عہد کے عرب اطباء۔ آٹھواں باب: آغاز عہد بنو عباس کے سریانی اطباء نواں باب: یونانی سے عربی میں کتب طب کو منتقل کرنے والے اطبائے مترجمین۔ دسواں باب: عراق، الجزیرہ اور دیار بکر کے اطباء۔ گیارہواں باب: بلاد عجم کے اطباء

بارہواں باب: ہندی اطباء۔ تیرہواں باب: بلاد مغرب کے اطباء۔ چودہواں باب: مصر کے مشہور اطباء۔ پندرہواں باب: شام کے مشہور اطباء

عیون الانباء کے متن کا تدریجی ارتقا

ابن ابی اصیبعہ نے عیون الانباء کا ابتدائی نسخہ ۶۴۱ھ/۱۲۴۳ء سے قبل مرتب کر لیا تھا۔ رفیع الدین الجیلی کے ترجمہ میں ابن ابی اصیبعہ لکھتا ہے:

ان القاضی رفیع الدین وقف	قاضی رفیع الدین میری موجودگی میں اس کتاب
علی نسخۃ من ھذا الکتاب بحضوری[2]	(عیون الانباء) کے نسخے سے واقف ہوا۔

اور آگے چل کر بتاتا ہے کہ رفیع الدین الجیلی کا انتقال ذوالحجہ ۶۴۱ھ (مئی ۱۲۴۴ء) میں ہو گیا تھا۔ غالباً اسی بیان کی روشنی میں بروکلمن اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ کتاب کا پہلا ایڈیشن ۶۴۰ھ/۳-۱۲۴۲ء میں مرتب کیا گیا تھا[3] کرد علی کا یہ بیان کہ کتاب کا ابتدائی نسخہ ۶۴۳ھ/۱۲۴۵ء میں تیار ہوا۔[4] درست نہیں ہے۔ انہیں غالباً یہ غلط فہمی اس وجہ سے ہوئی کہ ابن ابی اصیبعہ نے الصاحب امین الدولہ کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ میں نے اس کی فرمائش پر ۶۴۳ھ میں اس کتاب کا ایک نسخہ لکھوا کر ایک مدحیہ قصیدہ کے ہمراہ اس کی خدمت میں پیش کیا۔[5]

کتاب کا ابتدائی نسخہ مرتب کرنے کے بعد مولف اٹھائیس سال زندہ رہا اور اس عرصے میں وہ مسلسل اضافات کرتا رہا مثلاً ابن القفطی کی تاریخ الحکماء کے حوالے سے جو اضافے کیے گئے ہیں وہ ابتدائی ایڈیشن میں موجود نہیں ہیں۔[6] اسی طرح مصنف کے ذاتی علم کی بنا پر اضافوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اس دوران میں جن لوگوں سے مصنف کی مراسلت یا ملاقات ہوئی، ان کی تالیفات یا اشعار سے آگاہی ہوئی انہیں بھی کتاب میں شامل کر لیا گیا۔ عزالدین السویدی (م ۶۹۰ھ/۱۲۹۱ء) کے اشعار جن میں اس نے عیون الانباء کی تعریف کی ہے۔[7] اس کتاب میں شامل ہے جو یقیناً بعد کے نسخہ میں شامل کیے گئے ہیں۔ کتاب کی داخلی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مولف

اپنی وفات (جمادی الاول ۶۶۸ھ سے چھ ماہ قبل تک اس میں اضافے کرتا رہا ہے۔ مہذب الدین ابو سعید محمد بن ابی حلیقہ کے ترجمہ میں ابن ابی اصیبعہ لکھتا ہے،

وصلنی کتابہ وھو فی معسکر المنصور الظاھری فی شھر شوال سنۃ سبع وستین وستمائۃ۔

مجھے اس کا خط شوال ۶۶۷ء میں ملا جب کہ وہ المنصور الظاہری کی چھاؤنی میں تھا۔

اور عماد الدین الدنیسری کے حالات اور اس کے اشعار کا ایک عمدہ انتخاب دیتے ہوئے مصنف لکھتا ہے:

واول اجتماعی بہ کان بدمشق فی شھر ذی القعدہ سنۃ سبع وستین وستمائۃ[9]

میری اس سے پہلی ملاقات دمشق میں ذی القعدہ ۶۶۷ء میں ہوئی۔

گویا اپنی وفات سے چھ ماہ قبل جس طبیب کے حالات سے وہ آگاہ ہوا اس کا ذکر بھی کتاب میں کر دیا اس طرح ابن ابی اصیبعہ نے تراجم کو جامع اور جدید ترین (UP TO DATE) رکھنے کی پوری سعی کی۔

عیون الانباء کے مخطوطہ نسخے

مصنف کی زندگی میں ہی عیون الانباء کے نسخے تیار ہونے شروع ہو گئے تھے۔ چنانچہ دنیا کی معروف لائبریریوں میں اس کے کم از کم اکیس مخطوطہ نسخے موجود ہیں۔ جن میں سے سترہ کی بروکلمن نے نشاندہی کی ہے[10]۔ ان کے علاوہ الخدیویہ[11]، جامعہ کتب خانہ سندھ[12]، نور عثمانیہ[13]، اور حمیدیہ[14] میں اس کے نسخے محفوظ ہیں لیکن ان نسخوں میں باہمی اختلاف ہے۔

عیون الانباء کے اختلاف نسخ کا سبب

عیون الانباء کے مختلف نسخوں میں باہمی اختلاف کا اصل سبب جیسا کہ پہلے گزر رہا ہے کہ کتاب میں اٹھائیس سال کی طویل مدت تک

مصنف جا بجا ترمیم و تنسیخ اور حک و اضافہ کرتا رہا جب کہ اس دوران میں کتاب کی نقول بھی تیار ہوتی رہیں جیسا کہ ابو حلیقہ اور الصاحب امین الدولہ کے تذکروں میں مذکور ہے[15]۔

کرد علی نے اپنے استاد شیخ طاہر الجزائری کے حوالے سے اختلاف نسخ کا ایک اور سبب بھی بتایا ہے اور وہ یہ کہ ابن ابی اصیبعہ نے آزادی طبع کے باعث کتاب میں خاصی تعداد میں ایسے اشعار نقل کیے ہیں جو ادب مکشوف کے ضمن میں آتے ہیں۔ اس لیے جب کسی ایسے شخص کے لیے نسخہ تیار کیا جاتا جس پر وقار غالب ہوتا تو ایسے اشعار حذف کر دیے جاتے اور جو لوگ ایسی تحریروں سے محظوظ ہوتے تھے ان کے لیے کتاب کا مکمل نسخہ تیار کیا جاتا[16]۔

عیون الانباء میں الحاقی مواد

عیون الانباء میں دو اضافے ایسے ہیں جو یقیناً الحاقی ہیں اور مصنف کی وفات (۶۶۸ھ/۱۲۷۰ء) کے بعد کیے گئے ہیں اور وہ موفق الدین یعقوب السامری اور ابوالفرج بن القف کی تاریخ ہائے وفات ہیں[17]۔ اول الذکر کی تاریخ وفات ۶۸۱ھ (۱۲۷۲ء) اور موخر الذکر کی جمادی الاولیٰ ۶۸۵ھ/ (جولائی ۱۲۸۶ء) درج کی گئی ہے، حالانکہ ابن ابی اصیبعہ اس سے بہت پہلے وفات پا چکا تھا ان دونوں اطباء کی تاریخ وفات ان کی تالیفات کی فہرست کے بعد آخر میں درج کی گئی ہے جب کہ ابن ابی اصیبعہ نے تمام تراجم میں اس امر کا التزام کیا ہے کہ تاریخ وفات (اگر معلوم ہو تو) تالیفات کی فہرست سے قبل دی جائے اور فہرست کتب پر ترجمہ ختم کیا جائے۔ عین ممکن ہے کہ ان دونوں کی تصانیف کی فہرست بھی کلی یا جزوی طور پر الحاقی ہو۔

عیون الانباء فی طبقات الاطباء کی طباعت

عیون الانباء کا مکمل متن پہلے امراء القیس الطحان نے ۱۸۸۲ء میں قاہرہ سے دو جلدوں میں شایع کیا جس کے ساتھ نامکمل انڈکس تھا۔ اس کو آگسٹ ملر (AUG. MULLER) نے ایک سو باسٹھ اضافی صفحات لگا کر

جرمن دیباچہ کے ساتھ کوئنگز برگ سے ۱۸۸۴ء میں شایع کیا۔ یہ صفحات زیادہ ترتصحیح متن اور اختلاف نسخ سے متعلق تھے۔ اس کے بعد عیون الانباء کے متعدد تجارتی ایڈیشن شایع ہوئے۔ بیروت سے ۱۹۵۵ء میں نزار رضا کی برائے نام شرح و تحقیق کے ساتھ جو نسخہ شایع ہوا وہ ان اغلاط اور بیاضوں کے باوجود جن کی تصحیح و تکمیل نہیں کی گئی [18] تمام مطبوعہ نسخوں سے بہتر ہے تاہم کتاب کی اہمیت اور اس کی موجودہ طباعتی حالت اس امر کی متقاضی ہے کہ اس کے تمام مخطوطے حاصل کرکے جدید اسلوب تحقیق کے مطابق منقح نسخہ تیار کیا جائے [19]۔

عیون الانباء کا اسلوب تدوین

عیون الانباء بلاد و امصار کی ترتیب پر مدون کی گئی اور جزوی طور پر طبقات کے اسلوب کو ملحوظ رکھا گیا ابواب کی باہمی ترتیب میں باب ۱۰ سے ۱۵ تک کلیۃً بلاد کی ترتیب پیش نظر رکھی گئی البتہ ہر باب کی داخلی ترتیب میں کسی حد تک طبقاتی پہلو کا لحاظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اس میں بھی دقت نظر کا مظاہرہ نہیں کیا گیا بلکہ اطباء کے ایک خاندان کی کئی نسلوں کا یکجا تذکرہ کرنے کے بعد اطباء کے دوسرے خاندان کے مورث اعلیٰ کے ترجمہ سے شروع کرکے ترتیب نزولی کے مطابق تذکرہ کیا گیا۔

اس طرح کئی پہلے مذکور ہونے والے افراد زماناً متاخر اور کئی بعد میں آنے والے زماناً متقدم ہیں [20]۔

بعض لوگوں کے تراجم مختصر ہیں اور بعض کے طویل۔ تفصیلی تراجم میں بالعموم درج ذیل معلومات دی گئی ہیں۔

۱۔ صاحب ترجمہ کا نام، لقب اور کنیت۔

۲۔ والد کا نام، لقب، کنیت اور سلسلہ نسب بعض حالات میں تیس پشتوں تک [21]۔

۳۔ مولد اور تاریخ ولادت اگر معلوم ہو۔

۴۔ نشو و نما کہاں پائی، تعلیم کہاں حاصل کی، کن اساتذہ سے استفادہ کیا۔

۵۔ وہ علوم جن میں مہارت حاصل کی مثلاً طب، علوم حکمیہ، ریاضی، نجوم، حدیث، فقہ، ادب وغیرہ۔

۶۔ طبی مقام، کس کس بادشاہ یا امیر کی خدمت کی، ہسپتال میں کام کیا، آزادانہ پریکٹس کی، بیماروں کے ساتھ برتاؤ، طب کی کسی خاص شاخ مثلاً کحالی، جراحی وغیرہ میں مہارت۔

۷۔ تدریس طب میں خدمات۔

۸۔ ہم عصر اطباء کے ساتھ تعلقات، باہمی معلومات اور کتب کے تبادلے، افادہ و استفادہ مناظرے اور اختلافات، باہمی دشمنی اور ایذا رسانی وغیرہ۔

۹۔ اسفار کا تذکرہ اور ان کے مقاصد اور تاریخوں کا تعین۔

۱۰۔ زندگی کے اہم واقعات، بادشاہوں کی طرف سے نوازشوں اور عتاب کی تفصیلات معاشرتی اور سیاسی زندگی میں کردار، نوادر اور علاج کے عجیب و غریب واقعات۔

۱۱۔ تاریخ وفات، جائے وفات، سبب وفات اور مدفن اگر معلوم ہوں۔

۱۲۔ اولاد یا قریبی رشتہ دار جو طب کے پیشے سے منسلک ہوئے ہوں۔

۱۳۔ اسماء کتب مولفہ بالخصوص کتب طب و فلسفہ۔

۱۴۔ نثر کے نمونے بالخصوص پُر حکمت مقولے۔

۱۵۔ نمونۂ اشعار۔

تراجم بیان کرتے ہوئے ابن ابی اصیبعہ بالعموم اپنا ماخذ بتاتا ہے اور جہاں کہیں صاحب ترجمہ کے اپنے بیان کردہ حالات دستیاب ہوں انہیں من و عن نقل کر دیتا ہے [22]۔ نیز ان کی تحریر کردہ کتب سے بھی ان کے حالات اور ان کے علمی مقام پر روشنی ڈالتا ہے مثلاً حنین بن اسحاق یونانی کتابوں کے تراجم کے لیے جس نوع کا ورق استعمال کرتا تھا اور جس انداز کے حروف اور سطریں لکھتا تھا اور اس عمل سے جو مقصد اس کے پیش نظر تھا اور

اس کی نیت سے قطع نظر اس کا جو فائدہ ہوا اس کو ابن ابی اصیبعہ یوں بیان کرتا ہے:

"ان میں سے بہت سی کتابیں میری نظر سے گزری ہیں، میں نے ان سے استفادہ بھی کیا کوفی رسم الخط میں حنین کے کاتب الازرقی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی بہت موٹے موٹے حروف ہیں، ہر صفحہ پر چند سطریں ہیں اور ہر ورق اتنا موٹا جتنا آج کے تین چار اوراق مل کر بنتے ہیں ثلث بغدادی تقطیع میں۔ اس سے حنین کی غرض یہ تھی کہ کتاب کا حجم بڑھ جائے اور وزن زیادہ ہوجائے کیونکہ اس کے برابر تول کر درہم دیے جاتے تھے۔ اس نوع کا ورق اگرچہ وہ مخصوص مقاصد کے تحت استعمال کرتا تھا لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ کتابیں اتنا طویل عرصہ گزرنے پر بھی ضایع نہیں ہوئیں۔"[23]

ابن دینار کے ترجمہ میں لکھتا ہے:

وجدت لہ اقرباذینا بدیع	مجھے اس کی ایک اقرباذین ملی تھی جو تالیف
التالیف، بلیغ التصنیف، حسن	کی عمدگی، تصنیف کی بلاغت، مواد کی خوبصورتی
الاختیار، مرضی الاخبار[24]	اور معیار کی بالیدگی کا نمونہ تھی۔

ابن ابی اصیبعہ نے مختلف کتابوں پر درج شدہ حواشی کو بھی تراجم نگاری میں اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے مثلاً ابن ابی صادق تلمیذ ابن سینا کے ترجمہ میں اس کی تالیف شرح کتاب الفصول بقراط کے ذکر کے بعد لکھتا ہے:

وجدت خطہ علی ھذا الشرح	اس شرح پر جو اس کے کسی شاگرد نے
بتاریخ سنۃ ستین واربعمائۃ	اس سے پڑھی تھی اس کے ہاتھوں سے
علی قراۃ من قراہ علیہ۔	سن چار سو ساٹھ کی تاریخ درج تھی۔

اور اس مصنف کی دوسری کتاب شرح کتاب منافع الاعضاء لجالینوس کے بارے میں

رقم طراز ہے:

وجدت الاصل من ھذا	میں نے اس کتاب کا اصل نسخہ دیکھا
الکتاب تاریخ الفراغ منہ	جس پر ابن ابی صادق کے دستخط کے
فی سنۃ تسع وخمسین واربعمائۃ	ساتھ کتاب کی تالیف سے فراغت کا
موقعا علیہ بخط ابن ابی صادق	سال ۴۵۹ھ درج تھا اور لکھا تھا:
ماھذا مثالہ: بلغت المقابلۃ	میں نے اس کا اصل سے مقابلہ کرکے
وصح ان شاء اللہ تعالی وبہ	تصحیح کر دی ہے اور اب یہ انشاء اللہ
الثقۃ[25]	قابل اعتماد نسخہ ہے۔

بالعموم ترجمہ صاحب ترجمہ کے حالات پر ہی مشتمل ہوتا ہے لیکن بعض اوقات کسی مناسبت کی وجہ سے دوسرے لوگوں کے تذکرے بھی آگئے ہیں مثلاً ابوالقاسم ہبۃ اللہ بن فضل البغدادی (م ۵۵۸ھ/۱۱۶۲ء) کے حالات میں الحیص بیص شاعر کا تذکرہ کیا گیا ہے جو دو صفحات پر پھیلا ہوا ہے[26]۔ اسی طرح جن شعراء نے صاحب ترجمہ کی مدح، ہجو یا مرثیہ میں کوئی قصیدہ کہا ان کا اجمالی تعارف کرایا گیا ہے اور اس نوع کی متعدد مثالیں ہیں[27]۔

ابن ابی اصیبعہ کا اسلوب نگارش

ابن ابی اصیبعہ کا اسلوب نگارش سادہ، حقیقت پسندانہ اور ترجمہ نگاری کے عین مطابق ہے اس نے تراکیب کے زیر و بم، مقفی اور مسجع عبارت آرائی اور الفاظ کی کہکشاں سجانے سے مطلقاً گریز کیا ہے۔ وہ باحوالہ روایت بیان کرنے کے باوجود اس کی صحت و سقم کی ذمہ داری ماخذ پر نہیں ڈالتا بلکہ روایت پر ناقدانہ تبصرہ کرتا ہے۔ مثلاً الکندی کے بارے میں صاعد الاندلسی کی تنقید نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے:

"قاضی صاعد نے کندی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں بہت زیادتی کی گئی ہے،"

اس نوع کے تبصرے سے نہ تو کندی کا مقام و مرتبہ کم ہوتا ہے اور نہ لوگوں کو اس کی تالیفات سے استفادہ کرنے سے روکا جا سکتا ہے"[28]

اسی طرح یہ روایت کہ رازی نے بیمارستان عضدی کے لیے جگہ کا انتخاب کیا۔ کمال الدین ابوالقاسم بن ابی تراب البغدادی کے حوالے سے اسے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: "صحیح بات یہ ہے کہ رازی عضد الدولہ بن بویہ سے پہلے گزرا ہے"[29]

البتہ اس کی تحریر میں وہ خامی ضرور ہے جو اس عہد کے دیگر تذکرہ نگاروں میں بھی پائی جاتی ہے سوتر (SUTER) نے البدیع الاسطرلابی کے تذکرہ میں اس کی نشاندہی کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"ساتویں صدی ہجری / تیرہویں صدی میلادی کے عام مورخوں اور سیرت نگاروں کے بارے میں یہ دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنے قریب تر زمانے کے علماء کے کام کی تعریف میں مبالغے کے مرتکب ہوجاتے تھے جس سے ان علماء کی قدر و منزلت کو نقصان پہنچتا تھا جو عرب علوم کے آسمان پر ان سے پہلے مہر نیم روز بن کے چمکے۔ البدیع الاسطرلابی کی جو تحسین و آفرین کی گئی ہے وہ البتانی، ابوالوفاء اور البیرونی کے سلسلے میں کہیں نظر نہیں آتی، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ فضیلت و علم میں البدیع الاسطرلابی سے کہیں زیادہ ممتاز تھے"[30]

ابن ابی اصیبعہ کی تذکرہ نگاری کی یہ بات بہت کھٹکتی ہے کہ وہ اپنے احباب و معاصرین کی تعریف میں پورا زور قلم صرف کر دیتا ہے مثلاً وہ اپنے ایک عزیز دوست کا تعارف یوں کراتا ہے:

"حکیم اجل، یگانۂ روزگار، عالم ابواسحاق ابراہیم بن محمد، سعد بن معاذ کی اولاد سے، علامۂ دہر، یگانۂ عصر، مجموع الفضائل، کثیر الفواضل، عالی نسب، بلند حسب، پیکر سخاوت، محافظ اخوت، صنعت طب میں مشغول ہوا تو اتنا رسوخ حاصل کر لیا جس سے بڑھ کر ممکن نہیں اور کوئی دوسرا طبیب اسکے مقام کو نہیں پہنچ سکا، طب کے کلیات و جزئیات پر حاوی۔۔۔۔

ادب کا مطالعہ کیا تو اس میں اعلیٰ مرتبے پر فائز ہوگیا، عربی میں راسخ، علوم ادبیہ اور شاعری میں اس مقام پر فائز ہے کہ تمام شعراء اس کے سامنے عاجز اور بے بس ہیں۔ متقدمین و متاخرین اس کے آگے کوتاہ قد نظر آتے ہیں۔ فصیح الفاظ، صحیح معانی، صنعت تجنیس، تطبیق بدیع اور دوسری تمام صنعتوں میں ماہر، نظم اور نثر دونوں کا شہسوار، سب سے زیادہ سریع گو شاعر اور خوبصورت نثر نگار، میں نے بارہا اسے فی البدیہ مختلف موضوعات پر اس طرح شعر کہتے دیکھا کہ اس کے علاوہ کوئی شخص اس پر قادر نہیں"[31]

اس طویل توصیفی اقتباس کے مقابلے میں ابوبکر محمد بن زکریا الرازی کے تعارف کے کلمات ملاحظہ ہوں:

مولدہ ومنشئوہ بالری و	رے میں پیدا ہوا وہیں پروان چڑھا
سافر الی بغداد واقام بہا مدۃ[32]	بغداد کا سفر کیا اور وہاں مدت تک قیام رہا۔

اس کے بعد الرازی کا پورا ترجمہ پڑھیے تو کسی طرح یہ محسوس نہ ہوگا کہ وہ مذکورہ بالا طبیب (ابواسحاق ابراہیم بن محمد) کے مقابلے میں کسی شمار و قطار میں ہے جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

ابن ابی اصیبعہ کا تغافل و اغماض

ابن ابی اصیبعہ نے عیون الانباء میں بعض ایسے اطباء کا تذکرہ بھی کیا ہے جن کے پورے نام سے بھی وہ واقف نہیں اور نہ ہی ان کا کوئی قابل ذکر طبی کارنامہ اس کے علم میں آیا۔[33] لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ اس نے اپنے ایک معاصر اور ہم وطن طبیب ابن النفیس علی بن ابی الحزم القرشی (م ۶۸۷-۱۲۸۸ء) کا تذکرہ ہی نہیں کیا جو نہ صرف ابن ابی اصیبعہ کے استاذ مہذب الدین الدخوار کا شاگرد بلکہ اس عہد کا سب سے قدآور طبیب تھا۔ وہ جہاں کئی ضخیم علمی کتابوں کا مصنف تھا[34] وہاں اسے یہ اعزاز بھی حاصل تھا کہ وہ پھیپھڑوں میں خون کی گردش دریافت کرنے والا پہلا طبیب تھا۔[35] غالباً اس کا سبب ان دونوں میں کوئی ایسا اختلاف

ہے جسے ابن ابی اصیبعہ نظر انداز نہیں کر سکا۔[۲۶] حالانکہ اس نے بلا امتیاز مذہب و ملت یہودی، عیسائی، مجوسی، ہندو، صابی تمام ادیان کے حامل اطبار کے نہ صرف تراجم لکھے بلکہ ہر ایک کو اس کا جائز مقام دیا لیکن ابن النفیس کے معاملے میں ابن ابی اصیبعہ سے ایسی مورخانہ کوتاہی ہوئی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

عیون الانبا فی طبقات الاطبار میں تراجم کی تعداد ابن ابی اصیبعہ نے ان افراد کے علاوہ جن سے اس نے روایت کی یا جن کا بعض اطبار کے تراجم میں ضمناً ذکر کیا کل چھ سو اکیاسی افراد کا تذکرہ کیا ہے جن میں سے چار سو چودہ ایسے اطبار ہیں جن کے ناموں کو طرز عنوان بنا کر ان کے تراجم لکھے گئے ہر چند کہ ان میں سے کچھ مختصر اور کچھ طویل ہیں۔ دو سو ترپن ایسے اطبار ہیں جو طبیب اسقلبیوس سے لے کر یحییٰ النحوی (م بعد ۱۹ھ/ ۶۴۰ء) کے عہد تک مختلف ادوار میں گزرے ہیں ان میں سے تیرہ کی تالیفات کے نام بھی بتائے ہیں اور باقی دو سو چالیس کے صرف نام بتائے ہیں۔ ان کے علاوہ تین یونانی عہد کے شعراء ہیں اور گیارہ ایسے افراد ہیں جو عباسی عہد میں مترجمین کی سرپرستی کرتے تھے۔

عیون الانبار کے اہم مضامین عیون الانبار فی طبقات الاطبار اگرچہ بنیادی طور پر اطبار بلکہ زیادہ وسیع مفہوم میں علوم عقلیہ کے علمار کے تذکروں پر مشتمل تالیف ہے جس میں جغرافیائی اور طبقاتی دونوں پہلوؤں کو ایک حد تک مدنظر رکھا گیا ہے تاہم اس کے مندرجات کا دائرہ بڑا وسیع اور متنوع ہے۔ مصنف نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ وہ اطبار کے حالات زندگی ضبط تحریر میں لائے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مختلف ادوار کی سیاسی تاریخ، معاشرتی، سماجی اور انسانی روایات، طبی و نفسیاتی حکایات، لطائف و ظرائف، نوادر و عجائبات، ہر قسم کی شاعری کے منتخب نمونے اور علمی و ادبی سرگرمیوں کے واقعات درج کر کے اپنی تالیف کو نہ صرف زیادہ

مقبول اور دلچسپ بنایا بلکہ اس کی تاریخی اہمیت میں بھی اضافہ کیا ہے۔ ان میں سے بعض عنوانات ایسے ہیں جنھیں نہایت اہتمام سے ابن ابی اصیبعہ نے شامل کتاب کیا ہے۔ ذیل میں ان پر بالترتیب مختصراً گفتگو کی جاتی ہے۔

نوادر اس سے مراد وہ عجیب و غریب اور سنسنی خیز حکایات و قصص ہیں جو ہر پڑھنے سننے والے کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لیتے ہیں۔ ابن ابی اصیبعہ نے ادب کی اس نوع کو بطور خاص اپنی توجہ کا مستحق قرار دیا اور اپنی کتاب میں متعدد ناقابل یقین طبی معالجات کا تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً ابو الفرج جورجس بن یوحنا الیبرودی کے ترجمہ میں وہ لکھتا ہے کہ دمشق میں ایک تنور پر ایک شخص روٹیاں لگا رہا تھا اتنے میں وہاں سے ایک خوبانیاں فروخت کرنے والا گزرا۔ روٹیاں لگانے والے نے خوبانیاں خرید کر گرم گرم روٹی کے ساتھ کھائیں اور کھاتے ہی بے ہوش ہو کر گر گیا۔ لوگوں نے دیکھا تو مر چکا تھا۔ اطبار کے پاس لے گئے تو انھوں نے اس کی موت کی تصدیق کر دی چنانچہ اس کی تجہیز و تکفین کر کے جنازہ گاہ کی طرف لے جا رہے تھے کہ راستے میں الیبرودی مل گیا اس نے کہا کہ جنازہ اتار کر مجھے دکھائیں لاش دیکھنے کے بعد اس نے اس کا منہ کھول کر اس میں کوئی دوائی ڈالی یا حقنہ کیا جس سے اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور تندرست ہو کر واپس اپنے تنور پر کام کرنے لگ گیا۔[۲۷]

اس نوع کے کئی اور واقعات ابن ابی اصیبعہ نے بیان کیے ہیں جن میں کسی بظاہر مردہ شخص کو کسی طبیب کے ہاتھوں حیات نو ملی۔[۲۸]

نفسیاتی علاج اسلامی عہد کے اطبار جہاں کلینکی علاج کے ماہر تھے وہاں نفسیاتی علاج کی اہمیت سے نہ صرف آگاہ تھے بلکہ اسے کامیابی سے استعمال کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ ابن ابی اصیبعہ نے نفسیاتی طریق سے مریضوں کا علاج کرنے کے متعدد واقعات بیان کیے ہیں

مثلاً اوحد الزمان ہبۃ اللہ بن ملکا کے ترجمہ میں لکھتا ہے کہ بغداد میں مالیخولیا کا ایک مریض تھا جسے یہ وہم ہوگیا تھا کہ اس کے سر پر ایک گھڑا رکھا ہوا ہے۔ وہ ہر وقت چلتے پھرتے، لوگوں سے ملتے جلتے اس بات کا خیال رکھتا کہ اس کا موہوم گھڑا کہیں گر نہ جائے۔ کئی اطباء نے اس کا علاج کیا لیکن فائدہ نہ ہوا۔ آخر مریض ابن ملکا کے پاس لایا گیا۔ اس نے نفسیاتی انداز سے اس کا علاج کیا۔ اس نے اپنے دو ملازموں کو کچھ ہدایات دیں اور خود مریض سے اس کے مرض کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہر وقت سر پر گھڑا اٹھائے پھرنا ناپسندیدہ بات ہے۔ اتنے میں ایک ملازم نے مریض کے سر پر زور سے ڈنڈا گھمایا اور دوسرے نے ایک گھڑا بلندی سے مریض کے قریب پھینک دیا جو چکنا چور ہوگیا۔ مریض یہ سمجھا کہ اس کے سر پر رکھا ہوا گھڑا ٹوٹ گیا ہے۔ ہر چند کہ اس نے اس نقصان پر افسوس کا اظہار کیا لیکن اسے اس وہم سے مکمل طور پر نجات مل گئی۔[۳۹]

اسی طرح عیسیٰ ابو قریش نے عیسیٰ بن جعفر المنصور کے موٹاپے کا علاج اس طرح کیا کہ تین دن باقاعدگی سے اس کی نبض دیکھنے کے بعد اسے کہا کہ اگر تم چالیس دن تک زندہ رہے تو تمہارے موٹاپے کا تین دن میں علاج کر دوں گا تاہم تم وصیت کر دو۔ نتیجتاً متوقع موت کے خوف سے عیسیٰ بن جعفر کا موٹاپا خود بخود تحلیل ہوگیا۔[۴۰]

حواشی و تعلیقات

[۱] مقدمہ عیون الانباء، ۷ [۲] اصیبعہ، ۷۴۶ [۳] ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM, LONDON, 1960, 3:693 G.A.L.1:352.6 [۴] کنوز الاجداد، دمشق ۱۹۵۰ء، ۲۲۴ [۵] اصیبعہ، ۲۵ [۶] لیپرٹ، مقدمہ تاریخ الحکماء، لیپزنگ ۱۹۰۳ء، ۱۱-۲ [۷] اصیبعہ، ۶۰ [۸] ایضاً، ۵۹۸ [۹] ایضاً، ۶۱ [۱۰] G.A.L.1:325-6. S.1:560 [۱۱] فہرست الخدیویہ، ۵: ۹۲-۳ [۱۲] یکے جامع کتب خانہ سندہ، ۴۷ [۱۳] نور عثمانیہ کتب خانہ، ۲۰۲ [۱۴] حمیدیہ کتب خانہ، ۵۶ [۱۵] اصیبعہ، ۵۹۰، ۲۵-

[۱۶] کنوز الاجداد، ۳۳۷ [۱۷] اصیبعہ، ۷۶-۸ [۱۸] اغلاط کی تصحیح کے لیے دیکھیے راقم کا مقالہ عیون الانباء کی اغلاط کی تصحیح (زیر طبع) بیاض کی تکمیل زیر نظر مقالہ کے آخر میں کر دی گئی ہے [۱۹] امید ہے کہ راقم کے مقالات منقح نسخہ تیار کرنے میں معاون ہوں گے [۲۰] مثال کے طور پہ باب ہشتم: خاندان بخت یشوع و خاندان طیفوری اور باب سیزدہم: خاندان بنو زہر و ما بعد میں یہی صورت حال ہوئی [۲۱] ملاحظہ ہو یعقوب بن اسحاق الکندی کا سلسلہ نسب، اصیبعہ، ۲۸۵ [۲۲] مثلاً حنین بن اسحاق (ص ۲۶۴-۷۰) ابن سینا (ص ۴۳۷-۹) اور عبد اللطیف بغدادی (۶۸۳-۹۰) کے حالات ان کی خود نوشت سوانح سے ماخوذ ہیں [۲۳] اصیبعہ، ۲۷۰ [۲۴] ایضاً، ۳۲۹ [۲۵] ایضاً، ۴۶۱ [۲۶] اصیبعہ، ۳۸۰-۳ [۲۷] مثلاً شرف الدین بن عنین کے اشعار ابن الخطیب الری کے بارے میں (ص ۴۶۳-۴) مہذب الدین ابو نصر الحلبی کے اشعار رشید الدین الصوری کی مدح میں (ص ۷۰۱) عز الدین الغنوی کا مرثیہ شمس الدین الخیوی کے لیے (ص ۶۴۹) [۲۸] اصیبعہ، ۲۸۷ [۲۹] ایضاً، ۴۱۵ [۳۰] ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM, 1:567 [۳۱] اصیبعہ، ۵۹۷ [۳۲] ایضاً، ۴۱۴ [۳۳] مثلاً البالسی (ص ۵۴۵) اور ابن الامین (ص ۵۳۸) کے نام سے ہی مصنف واقف نہیں ہے [۳۴] مثلاً الشامل فی الطب، الموجز، مختصر القانون وغیرہ [۳۵] جسے بعد میں ولیم ہاروے (۱۵۷۸-۱۶۵۷ء) کی طرف منسوب کیا گیا۔ دیکھیے: طفیل ہاشمی، مسلمانوں کے سائنسی کارنامے، اسلام آباد ۱۹۸۸ء، ۲۶۳ [۳۶] ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM, 3:693 [۳۷] اصیبعہ، ۶۱۳ [۳۸] دیکھیے اصیبعہ، ۳۷۶؛ ۴۱۸؛ ۴۱۴؛ ۲۹۶ [۳۹] اصیبعہ، ۳۷۴-۵ [۴۰] ایضاً، ۲۱۷

حضرت باباتاج الدین ناگپوری سے علامہ اقبال اور شادؔ کی عقیدت

از پروفیسر اکبر رحمانی*

دانائے راز علامہ اقبال کی یہ دعا قبول ہوئی:

مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں

اس لیے علامہ تصوف کے خلاف تھے نہ صوفیائے کرام کے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں جس فلسفہ خودی کو پیش کیا تھا اس کی تکمیل کے لیے ضبط نفس اور اطاعت کو ضروری قرار دیا تھا اور صوفیائے کرام کی زندگیاں ضبط نفس اور اطاعت شعاری کا مدلل نمونہ تھیں۔ اس لیے علامہ تصوف سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے اور ان سے مستفیض ہوتے رہتے تھے۔ پروفیسر محمد فرمان کہتے ہیں:

"اطاعت اور ضبط نفس، اقبال کی خودی کے پہلے دو مراحل ہیں۔ ان مراحل کو جس خوبی اور جدوجہد کے ساتھ صوفیائے کرام نے طے کیا ہے اس کی شہادت صوفیاے کرام کی ہر تاریخ اور ہر تذکرے سے مل سکتی ہے۔ شیخ کے حکم کی تعمیل، نفس کی تربیت اور احکام الٰہی پر استقامت کے ساتھ پابند رہ کر جو کردار کا اعلیٰ نمونہ ان حضرات نے پیش کیا ہے وہ امت کے دوسرے

* مدیر اعلیٰ ماہنامہ آموزگار۔ جل گاؤں۔

برگزیدہ افراد کے ہاں کم نظر آتا ہے۔۔۔۔۔ اقبال کے فلسفۂ خودی کے لیے ان بزرگوں کی حیات طیبہ ہی کو عملی نمونے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اور اسی امر کو واضح کرنے کے لیے علامہ نے نکلسن کو اپنے مشہور مکتوب میں یہ لکھا تھا کہ یہ فلسفہ تمام تر مسلم صوفیہ کے مشاہدات و تصورات سے ماخوذ ہے"[1]

علامہ اقبال کے بعض مکاتیب سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے شیوخ و صوفیہ سے حسن عقیدت رکھتے تھے۔ بعض مزارات پر حاضری دیتے تھے اور دعا کے طالب ہوتے تھے۔ علامہ نے اپنے دل کی تشفی کے لیے ہر صاحب کرم سے استفادہ کرنے میں تامل نہیں کیا۔ اعجاز الحق قدوسی فرماتے ہیں:

"علامہ اقبال کو مردان حق آگاہ کی تلاش رہتی تھی۔ وہ جہاں کہیں بھی کسی اہل دل کا نام سنتے اس کی ملاقات کے لیے بے چین ہوتے"[2]

جب علامہ نے کامٹی (ناگپور) کے تاج الاولیا سید محمد باباتاج الدین ناگپوری کے عرفان و فیوض کا تذکرہ سنا اور حکیم اجمل خاں صاحب دہلوی اور لاہور کے احباب نے بھی تعریف کی تو ان کی زیارت اور ملاقات کی تمنا دل میں پیدا ہوئی۔ جس کا تذکرہ انہوں نے اپنے قریبی دوست یمین السلطنت مہاراجہ سر کشن پرشاد سے ایک خط میں کیا۔ لکھتے ہیں:

"... ناگپور میں ایک بزرگ مولانا تاج الدین نام ہیں۔ کیا سرکار نے کبھی ان کا نام سنا یا ان کی زیارت کی؟ حکیم اجمل خاں صاحب دہلوی سے ان کی بڑی تعریف سنی ہے اور لاہور کے ایک اور دوست بھی ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ ان کی خدمت میں

---

[1] اقبال اور تصوف۔ پروفیسر محمد فرمان۔ بزم اقبال لاہور ۱۹۸۴ء ص ۴۲۔۴۳ [2] اقبال کے محبوب صوفیہ۔ اعجاز الحق قدوسی۔ اقبال اکاڈمی پاکستان لاہور ۱۹۷۶ء ص ۵۰۸۔

حاضر ہونے کا قصد ہے۔ دیکھئے کب لاہور کی زنجیروں سے خلاصی ملتی ہے چشتی سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ چوبیس گھنٹے میں بیشتر حصہ مجذوبانہ حالت میں رہتے ہیں مگر سُنا ہے کہ رات کے دو بجے کے بعد سے صبح تک ان کے فیضان کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ حیدرآباد میں کوئی مولوی یا منشی محمد اسمٰعیل صاحب ان کے پیر بھائی ہیں۔ شاید سرکار کو معلوم ہو۔ غرض کہ جن جن ذرائع سے معلوم ہوا آدمی قابل زیارت ہیں"[1]

۲۷ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو پھر علامہ اقبال نے ایک خط مہاراجہ سرکشن پرشاد کو لکھا اور اس میں بھی حضرت باباتاج الدین ناگپوری سے اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کیا:

"سرکار والا تبار! تسلیم

نوازش نامہ مع "سفر نامہ ناگپور"[2] ملا۔ جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ میں نے اس چھوٹی سی کتاب کو بڑی حسرت سے پڑھا اور سرکار کی عقیدت سے دل کو ایک قسم کی روحانی بالیدگی ہوئی۔ میرا قصد بھی ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا ہے۔ بعض وجوہ سے تجدید بیعت کی ضرورت پیش آئی ہے۔ سُنتا ہوں کہ وہ مجذوب ہیں مگر آج کل زمانہ بھی مجاذیب کا ہے، بہرحال اگر مقدر میں ہے تو انشاءاللہ ان سے مشکل کا حل ہوگا آج خواجہ سید حسن نظامی صاحب کو بھی خط لکھا ہے۔ اگر وہ بھی ہم سفر ہو گئے تو مزید لطف رہے گا"[3]

---

[1] محررہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۲۱ء، شاد بنام اقبال۔ مرتب عبداللہ قریشی۔ بزم اقبال لاہور۔ ۱۹۸۶۔ ص ۲۵۶۔ ۲۵۸ [2] اس سفرنامہ کا دوسرا نام "آنکھ والا آنکھ والے کی تلاش میں" ہے۔ (ایضاً ص ۲۶۴) راقم الحروف نے ادبیات اردو حیدرآباد دکن میں اس کتاب کا نام 'سیر ناگپور' لکھا دیکھا ہے اور اس کی زیراکس کاپی بنائی ہے۔ (اکبر رحمانی) [3] ایضاً ص ۲۶۳۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد (۱۸۶۴-۱۹۴۰ء) المتخلص بہ شاد ریاست حیدرآباد دکن کے وزیر اعظم تھے۔ علم پرور اور شاعروں کے قدرداں تھے۔ ان کی شہرت پورے ہندوستان میں تھی۔ بقول محمد عبداللہ قریشی:

"والیان ریاست ان کو عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ادیب ان کو جانتے، شعراء ان کو پہچانتے، صوفیہ ان کی موحدانہ زندگی پر رشک کرتے، فلسفی ان کے خیالات پر سر دھنتے اور مورخ ان کے حالات قلمبند کرنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔

مولانا حالی نے ان کو اپنا 'مسدس' سُنایا، مولانا شبلی نے 'شعر العجم' کا تحفہ پیش کیا، علامہ اقبال نے ان کو 'اسرار خودی' اور 'رموز بے خودی' سمجھائے۔ اکبر الٰہ آبادی نے ان کو حکیمانہ شعر سُنائے۔ پیارے صاحب رشید اور دولہا صاحب نے ان سے اپنی مرثیہ گوئی کی داد پائی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار ان کی ڈیوڑھی پر برسوں براجمان رہے۔ علامہ نظم طباطبائی ان کے ممنون تھے تو حضرت جلیل مانکپوری ان کے شکر گزار۔ اختر مینائی انہیں کے فیض سے چمکے۔ ترک علی شاہ ترکی اور مولانا گرامی نے یہیں نام پایا۔ غبار انہیں کے خوان کرم کے زلہ ربا تھے۔ ثاقب نے یہیں اپنی خوش کلامی اور شاعری کے داؤ پیچ کے جوہر دکھلائے۔ دلورام کوثری نے انہیں کے سامنے یہ مصرع پڑھا تھا: گنگا سے جو پھسلا لب کوثر پہنچا

جوش کی رندانہ شاعری کی انہوں نے قیمت ادا کی۔ فانی کو ان کی قدردانیوں سے بقا نصیب ہوئی۔ غرض دکن کے شاعر ہوں یا باہر کے وہ اپنے کلام کی داد حضرت شاد ہی سے پاتے تھے"[1]

مہاراجہ ایک ایسے کھتری خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس نے عہد مغلیہ میں راجہ ٹوڈرمل اور

---

[1] ایضاً ص ۳-۴۔

عہد آصفیہ میں مہاراجہ چندولال جیسی عظیم شخصیتیں پیدا کیں۔ چندولال کی ادب پروری انسان دوستی داد و دہش اور شخصیت کی چھاپ اتنی گہری تھی کہ ایک زمانے میں حیدرآباد چندولال کا حیدرآباد کہلاتا تھا۔ یہی چندولال مہاراجہ کرشن پرشاد کے جد اعلیٰ تھے [1]

مہاراجہ کشن پرشاد راجہ ہری کشن سررشتہ دار محکمۂ نظم جمعیت کے فرزند تھے اور مہاراجہ نریندر پرشاد پیش کار و مدار المہام کے حقیقی نواسے تھے۔ نام پرشوتم داس تھا لیکن نانا نے کشن پرشاد کہہ کر پکارا اور یہی نام چل نکلا۔ انہوں نے بہت جلد فارسی، سنسکرت، عربی، اردو، خطاطی اور فنون سپہ گری میں دستگاہ حاصل کی۔ چند دن مدرسۂ عالیہ میں بھی تعلیم پائی۔ والد اور نانا کی وفات کے بعد نظام حیدرآباد دکن محبوب علی خاں نے ان کو موروثی خدمت پیشکاری سے سرفراز فرمایا اور خلعت عطا کی۔ پھر صدر المہام فوج اور وزیر افواج کے جلیل القدر عہدے پر مامور کیا اور ۱۹۰۱ء کو مدار المہامی سپرد کی جو ۱۹۱۲ء تک رہی۔ ۱۹۲۶ء میں پھر وہ صدارت عظمیٰ کے لیے منتخب کیے گئے۔ ۱۹۳۷ء تک مہاراجہ حیدرآباد کے سیاہ و سفید کے مالک رہے۔

مہاراجہ کا ماحول امیرانہ اور عادات فقیرانہ تھیں۔ "با مسلمان اللہ اللہ با برہمن رام رام" کا صوفیانہ مشرب رکھتے تھے۔ مندروں میں قشقہ لگاتے، مسجدوں میں نماز پڑھتے، مجالس عزا میں اشک بہاتے اور حال وقال کی محفلوں میں سر دھنتے تھے، نعتیں، منقبتیں، سلام اور مرثیے لکھ کر انہوں نے اپنی عقیدت وارادت اور دل گدازی کا ثبوت دیا۔ مہاراجہ کی تین رانیاں اور چار بیگمیں تھیں۔ ہندو رانیوں کی اولاد ہندو اور مسلمان بیگمات کی اولاد مسلمان تھیں۔ ختنہ بھی کرا لیا تھا۔ خواجہ اجمیری سے بے پناہ عقیدت کی بنا پر اپنے ایک صاحبزادے ارجن کمار کا نام خواجہ پرشاد رکھا تھا۔ ارجن کمار ایک ہندو رانی کے بطن سے تھا۔ ایک فرزند کا تاریخی نام "عالم پناہ مہاراجہ

[1] ایضاً۔ ص ۳-۴

عالمگیر پرشاد" اقبال نے تجویز کیا تھا۔ ہندو رانیوں کی اولاد کی شادیاں ہندوؤں سے اور مسلمان بیگمات کی اولاد کی شادیاں مسلمانوں سے کی گئیں۔

راجہ ارجن کمار عرف راجہ خواجہ پرشاد کو اپنا جانشین مقرر کیا اور اس کو جو وصیت کی اس سے مہاراجہ کی رواداری اور نیک خواہشات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس وصیت نامے کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

"میں سر کشن پرشاد یمین السلطنت کھتری مہر یعنی سپاہی نژاد صاحب سیف اپنی وصیت کو خدا کے نام سے شروع کرتا ہوں جو ایک ہے اور ایک ہی ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ میرا اعتقاد ہے کہ کوئی خدا سوائے ایک خدا کے سزاوار حمد نہیں ہے۔"

اس کے بعد اپنا مسلک بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں تعصب اور نفرت کو بُری نظر سے دیکھتا ہوں۔ ہر مذہب اور قوم کی عزت کرتا ہوں انصاف راستی اور عدل کو انسان کے بہترین جوہر سمجھتا ہوں کیونکہ انصاف ہر متنفس اور حکومت کے لیے بہترین خصلت ہے۔ میں اپنے اہل خاندان اور اولاد اور وارث کو ہدایت کرتا ہوں کہ خدا پر کامل بھروسہ رکھو۔ ہر تکلیف کا جواں مردی سے مقابلہ کرنا اور ہر مصیبت کو صبر سے برداشت کرنا صرف خدا ہی سے مدد طلب کرنا اور ہمیشہ اسی کی مشیت پر راضی برضا رہنا یہی وہ تعلیم ہے جو ہمارے بزرگوں سے ملتی چلی آئی ہے اور جس کی پیروی کرنا ایک کھتری اور ایک جواں مرد سپاہی کے لیے ضروری ہے، میں بھی تم سب کو نیکوکارانہ زندگی گزارنے اور بوقت مایوسی خدا سے امداد طلب کرنے کی ہدایت کرتا ہوں خصوصاً مجھے اپنے جانشین اور وارث راجہ خواجہ پرشاد سے توقع ہے کہ وہ ان سب امور کو جو میں نے مذہبی اعتقاد کے متعلق اوپر بیان کیے ہیں اپنا نصب العین بنائیں گے۔" [2]

[1] مہاراجہ کرشن پرشاد سے متعلق ساری معلومات 'شاد بنام اقبال' سے ماخوذ ہے۔

مہاراجہ کشن پرشاد شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی، انہوں نے ناول بھی لکھے اور سفرنامے بھی۔ انہوں نے چھوٹی بڑی ۴۰، کتابیں مختلف موضوعات پر لکھیں۔ ان کتابوں کے علاوہ ’رسالہ تزک عثمانیہ‘ بھی مہاراجہ کی سرپرستی میں جاری تھا۔

سفر ناگپور مہاراجہ کا مسلک صلح کل تھا۔ ہر مذہب وملت کی عبادت گاہوں کا احترام کرتے تھے۔ بزرگان دین اور صوفیائے کرام سے عقیدت رکھتے تھے۔ حضرت بابا تاج الدین ناگپوری سے بھی انہیں عقیدت تھی۔ انہوں نے اپنے لڑکے کی بیماری کے وقت بابا تاج الدین کی زیارت کے لیے ناگپور کا سفر بھی کیا تھا۔ بعد میں یہ سفرنامہ ’سفر ناگپور‘ کے نام سے شایع ہوا۔ اس سفرنامہ میں مہاراجہ نے بابا تاج الدین ناگپوری کا ذکر نہایت عقیدت سے کیا ہے۔ یہ سفرنامہ نایاب ہے اس کے چند اقتباسات ذیل میں درج کیے جارہے ہیں جو بڑے دلچسپ ہیں۔ بابا تاج الدین کی زیارت کے پس منظر کا ذکر کرتے ہوئے مہاراجہ لکھتے ہیں:

”میرے عزیز باتمیز سید معین الدین خاں نبیرۂ سردار علی خاں سردار دلیر جنگ مرحوم نے تین ماہ کے قبل مجھ سے برسبیل تذکرہ کہا تھا کہ ناگپور کے پرے (واکی) اسٹیشن کے قریب ایک بزرگ جو تاج الدین شاہ ولی کے نام سے مشہور ہیں نہایت کامل اور مستجاب الدعوات ہیں۔ ان کی اس رطب اللسانی کا تخم میرے دل میں بویا گیا اور شوق وذوق دید درشن کی آبیاری سے اس کی پرورش شروع ہوئی۔۔۔

کمسنی سے مجھے بزرگوں کے ساتھ بلا قید ملت ومذہب ایک خاص قسم کی عقیدت ہے۔ یہ سمجھنا چاہیے کہ میری گھٹی میں عقیدت کا پٹ پڑا ہے۔ اگرچہ انہیں دنوں میں طائر ارادہ کو تحریک ہوئی کہ چل کر درشن کرلوں لیکن کل امر مرھون باوقاتہا کے پر پروانہ شکستہ تھے اسلیے یہ بات اور ارادہ رفت وگزشت ہوگیا۔ دنیا عالم اسباب ہے۔

کسی سبب کا پیدا ہونا ضروری تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرا تیسرا لڑکا عثمانی پرشاد عدم بروز دندان کے باعث علیل ہوگیا تھا۔ اس میں طوالت پیدا ہوگئی اور بخار لازمی ہوگیا۔ ایک سو دو ایک سو کے درمیان میں اس کا چڑھاؤ اتار ہوتا تھا۔ ڈاکٹر اور یونانی اطبا نے عدم بروز دندان اس بخار کا باعث بتلایا اور وید نے صفرا اور بلغم کا اجتماع اس کا سبب ٹھہرایا۔ الغرض ایک مہینے تک ڈاکٹر ارسطو یار جنگ عبدالحسین جو افضل گنج ہسپتال کے سرجن اور نہایت مشہور اور ذی لیاقت ڈاکٹر ہیں بشرکت ڈاکٹر محمد حسین معالج رہے۔ اگرچہ اسہال میں افاقہ ہوا لیکن بخار نے بدستور اپنی عملداری کو قائم رکھا۔

مجبوراً حکیم میر احمد علی صاحب کا علاج شروع کرایا۔۔۔۔ تخمیناً دو مہینے تک ان کا علاج رہا جس سے بفضلہ اور عوارض میں تخفیف ہوئی لیکن بخار کی گرم بازاری کی اصلاح نہ ہونے پائی۔ اس اثنا میں میرے دوست حاذق الملک بہادر حکیم اجمل خاں صاحب دہلوی، راجہ رائے رایان متوفی جو اس وقت عارضہ دق سے فریش تھے انکے معالجہ کے لیے آئے تھے۔ میں نے اپنے لڑکے کو دکھایا۔ بشرکت حکیم احمد علی صاحب نسخہ تجویز کیا اور روزانہ ایک وقت آکر دیکھتے رہے، سلسلہ کوئی تقریباً ہفتہ عشرہ تک رہا۔ جبکہ یہ مرحلہ بھی طے ہوگیا تو بالاتفاق سب کی رائے ہوئی کہ تبدیل مقام کیا جائے اگرچہ میں نے بھی اس کو ضروری خیال کیا مگر مشکل یہ تھی کہ میری تیسری دختر کی شادی مہاراجہ کشمیر کے معتمد لالہ مہرچند کے فرزند سے قرار پائی تھی اور مہینہ جمادی الثانی مطابق ا مئی عیسوی مقرر ہوگیا تھا۔ اس لیے زیادہ تشویش ہوئی کہ اس کو کس طرح پورا کردں۔ بالآخر بعد مشورہ کے قرار پایا کہ فی الحال وقار آباد جہاں کی آب وہوا

اچھی سمجھی جاتی ہے اور حیدرآباد سے دو گھنٹے کا صرف ریل کا راستہ ہے وہاں چلا جاؤں چنانچہ میں نے فوراً حضور سے دو ہفتہ کی رخصت حاصل کرکے صرف بچہ اور اس کی ہمشیر جو دو سال کی ہے اور اس کی والدہ کو لے کر وقار آباد گیا۔ وہاں دو روز تک مزاج میں کسی قدر سکون رہا بلکہ ایک روز مقیاس الحرارت ۹۹ درجہ تک ہوگیا تھا۔ بخت و اتفاق کی بات ہے کہ ایک شب وہاں سرد ہوا چلی اور ابر آکر کسی قدر گرجا۔ برسا۔ کھل گیا۔ دوسرے روز صبح بچہ کو نزلہ کا انصباب ہوا اور کھانسی شروع ہوگئی۔ بخار کے مدارج میں ترقی ہوئی یعنی ایک سو تین سے کچھ زائد ہوگیا۔

بگوشتو ایک ہفتہ وہاں رہا مگر مفید نہ ہوا۔ ناچار پھر اپنے باغ عثمان منزل میں جو کرمن گھٹ کے قریب ہے فروکش ہوا۔ بخار روز بروز کسی قدر اور بڑھتا گیا۔ مگر طبیعت میں ہوشیاری اور توانائی تھی۔ اس عرصہ میں لاہور سے دولہا کی برات آگئی میں نے فوراً عثمان منزل سے اپنا بستر اٹھا کر مکان میں ڈیرہ جمایا۔ یہاں آنے کے دوسرے روز پھر انصباب نزلہ کا اس شدت سے ہوا کہ دونوں شش کی نالیاں بلغم سے بھر گئیں۔ میں نے فوراً یونانی علاج کو چند روز کے لیے ملتوی کرکے ڈاکٹر ہنٹ جو برٹش گورنمنٹ کے مسلم الثبوت سرجن ہیں اور ریلوے ڈپارٹمنٹ کے ڈاکٹر کہلائے جاتے ہیں ان کا علاج شروع کرایا۔۔۔۔ چنانچہ میرا خیال تھا کہ لڑکی کی شادی سے جلد فراغت پاؤں، ۶ تاریخ کو منگنی کی رسم ادا کر دیا۔۔۔۔ اسی شب دو بجے بچہ کا مزاج کسی قدر زیادہ اعتدال سے تجاوز کر گیا۔ بخار ایک سو چار سے زیادہ ہوگیا۔ کرب اور بے چینی اور بدخوابی تمام شب رہی۔ دماغ پر بھی کسی قدر اثر محسوس ہوتا تھا اب میں اپنی پریشانی کی حالت کس کو دکھاؤں اور کس سے کہوں بجز خدائے وحدہٗ

لاشریک کے۔ وہی اس کی قدر کرے گا جو صاحب اولاد ہو۔ بدنصیبی سے دس فرزندان نرینہ کے داغ اس کلیجہ پر موجود ہوتے ہوئے اپنے نور عین کی جس کے ساتھ بہت سی امیدیں خاندانی وابستہ ہیں، ایسی حالت دیکھ کر نہایت اضطرار اور فکر میں شب گزری۔

۔۔۔ صبح میں اور بھی بچہ کی حالت دگرگوں ہوئی جس کے باعث دل بے قابو ہوگیا اور طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ اپنے پیارے کی ایسی حالت یہاں رہ کر دیکھوں۔ فوراً ریل کے سیلون کا انتظام کرکے میں نے اپنے والد ماجد کو لکھ دیا کہ فی الحال شادی ملتوی کر دیا جائے۔ ہفتہ عشرہ کے لیے میں بغرض تغیر آب وہوا جاتا ہوں۔ ورنہ میری صحت پر برا اثر پڑنے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ آٹھ تاریخ روز پنج شنبہ وقت مغرب سب کو خدا حافظ کہہ کر گھر سے بحالت اضطرار روانہ ہوا اور برخوردار کی والدہ سے کہہ دیا کہ خدا پر نظر رکھ کر دعا کرتی رہیں۔ انشاءاللہ جب بخار میں کمی شروع ہوگی اس وقت واپس ہوں گا۔

اپنے ساتھ دو مصاحب۔ ایک منصبدار مرزا احمد بیگ دوسرے رام چندر پرشاد اور چند خدمتیوں کو لے کر ریل میں سوار ہوا۔ چلتے وقت بعض احباب کا یہ مشورہ کہ اس سفر سے گو تبدیل مقام اور سیر تفریح اور دفع افکار منظور ہے لیکن بہتر ہوگا کہ بیک کرشمہ دو کار۔ ناگپور کے سمت جا کر محمد تاج الدین شاہ ولی اللہ کی بھی درشن کر لوں تاکہ: دستے از غیب بره آید و کاری بکند

میں اس الہام کو بشارت سمجھ کر بسم اللہ مجریہا ومرسٰہا کہہ کر ناگپور کی طرف روانہ ہوا۔ تمام شب بیداری اور اختر شماری میں گزری۔ اس موقع پر ایک واقعہ دلچسپ جو اسی سے متعلق ہے لائق بیان ہے۔ وہ یہ کہ جس وقت وقار آباد سے واپس

ہوا میں نے مرزا احمد بیگ منصبدار کو زہرہ بی صاحب کے پاس جو مجذوبہ اور نہایت ستودہ صفات اور اہل بصیرت کی نظروں میں ممتاز سمجھی جاتی ہیں اور خورد سالی سے جن کے ساتھ مجھے دلی عقیدت ہے اور بارہا میں نے ان کے احکام اور اقوال کو تیر بہدف دیکھا اور پایا ہے، روانہ کیا اور منصبدار معز کو تاکید کر دی کہ وہ صرف جاکر میرا سلام پہونچا دیں اور نذر پیش کر دیں۔ جو جواب وہ دیں اس سے مجھے مطلع کریں چنانچہ وہ گئے اور میری نذر پیش کر کے سلام پہونچایا جس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ (وہاں جاکر آؤ سب کچھ ہوگا) اس فقرہ کی تعبیر اور تاویل اس وقت کسی کے ذہن میں نہیں آئی کہ کہاں جانا اور کہاں جانے سے کیا مطلب نکلے گا۔ الغرض اس وقت وہ بات رفت وگزشت ہوگئی تھی مگر دفعتاً ریل میں بر سبیل تذکرہ جب اس جملہ کی طرف منصبدار صاحب نے توجہ دلائی تو اسی وقت یہ عقدہ کھلا کہ ان کا منشا بھی تاج الدین شاہ کے پاس جانے کا تھا۔ سبحان اللہ بجھرہ سچ ہے کہ ؎

خاصانِ خدا خدا نباشند لیکن ز خدا جدا نباشند

---- تمام شب کچھ باتوں اور کچھ نیند میں گزری۔ ادھر شمع کو کوچ کا پروانہ ملا۔ ادھر خورشید خاور نے تمام عالم پر نور کا فور بکھیر دیا اور ساری دنیا اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوئی۔۔۔ الغرض قریب بارہ بجے کے بھساول کے اسٹیشن پر پہونچا۔۔۔ غالباً کوئی پون گھنٹے کے قریب مجھے اس اسٹیشن پر ٹھہرنا پڑا۔ الغرض وہاں سے ایک بجے کے قریب ناگپور کی طرف روانہ ہوا[1]

---

[1] مہاراجہ کا جملہ ہے "الغرض وہاں سے بارہ بجے کے قریب منماڑ کی طرف روانہ ہوا" جو درست نہیں ہے۔ مہاراجہ قریب بارہ بجے بھساول پہونچے تھے اور ان کا سیلون ناگپور گاڑی سے جوڑا گیا تھا۔ وہ وہاں پون گھنٹے ٹھہرے رہے اس لیے قریب ایک بجے روانہ ہوئے۔ (اکبر رحمانی)

۔۔۔۔ دسویں تاریخ بروز شنبہ پانچ بجے خدا خدا کر کے ناگپور پہنچا اور دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ شاہ صاحب راجہ رگھو بھوسلے کے مکان میں دو مہینے سے فروکش ہیں اور راجہ صاحب نے نہایت عقیدت مندی سے ان کو اپنے گھر کی دولت بنا رکھا ہے۔ چونکہ وقت مغرب کا ہو چکا تھا اور راجہ صاحب کے مکان میں بے تکلف جا بھی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے کہ آپس میں تعارف نہیں تھا مرزا احمد بیگ کو حضرت کی خدمت میں روانہ کیا اور مرزائے مذکور سے کہہ دیا کہ میرا سلام پہونچا دیں اور ان کے حالات سے واقف ہو کر مجھے اطلاع دیں۔ چنانچہ حسب ہدایت مرزائے مذکور وہاں پہنچے۔ اس وقت شاہ صاحب لیٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے موقع دیکھ کر میرا سلام پہونچایا جس کا انہوں نے یہ جواب دیا کہ "چراغ رکھ کر چراغ کی فکر کرتا ہے۔ کہہ دے کہ گھر کو چلا جائے"۔

مرزا نے وہاں سے واپس ہو کر ان کا جوابی پیام پہونچایا۔ میں نے شاہ صاحب کے قول کو تفاؤل نیک سمجھا اور حقیقت میں بھی اس کی تاویل بالکل حسب منشا اور نیک تھی لیکن اس امر کے سننے سے کسی قدر فکر ہوئی کہ شاہ صاحب بالکل مجذوب اور طبیعت کے تیز ہیں۔

صبح گھر سے تار آیا کہ بچہ کا مزاج شب کو زیادہ بگڑ گیا تھا۔ یہاں تک کہ دودھ بھی نہیں پیا اور تمام شب کرب اور بے چینی میں گزری۔۔۔۔ اس عرصہ میں عبدالعزیز صاحب میرے ملنے کے لیے آئے۔۔۔۔ بر سبیل تذکرہ انہوں نے یہ کہا کہ راجہ صاحب کو مجھ سے ملنے کا اشتیاق ہے اور ان کی یہ بھی خواہش ہے کہ وہ میرے لیے سواری اور گاڑی روانہ کریں اور شاہ صاحب سے پوچھ کر وہ جو وقت مقرر کریں میں اس وقت کا منتظر رہوں۔۔۔ میں نے ان کو صرف اس قدر جواب دیا کہ میں شاہ صاحب کی ملاقات کے لیے آیا ہوں،

چونکہ راجہ صاحب سے تعارف نہیں ہے۔ لہذا میں اس امر کو پسند نہیں کرتا کہ سواری اور گاڑی کے لیے تکلیف دوں۔ جس وقت مجھے فرصت ہوگی۔ عام طور پر جس طرح اور زائرین شاہ صاحب کے دیدار سے مستفیض ہوتے ہیں میں بھی سعادت حاصل کر کے نور سمیٹوں گا۔۔

۔۔۔رام چندر پرشاد کو حکم دیا کہ وہ میر صاحب کے ساتھ جاکر راجہ سے مل لیں۔۔۔۔ رام چندر پرشاد واپس آئے اور کہا کہ راجہ صاحب تو پوجا پاٹ میں مصروف تھے اس لیے یہ مل نہ سکے۔ البتہ زبانی پیام و سلام کے بعد راجہ صاحب نے یہ کہا کہ چھ سات بجے کے درمیان میں شاہ صاحب سے ملنے کے لیے وقت اچھا ہے۔۔۔

میں نے رام چندر پرشاد سے کہا، "بھئی آج کسی طرح مجذوب صاحب کے درشن سے فیض حاصل کرنا چاہیے۔ موٹر کی تلاش کرو کہ کرایہ سے مل جائے۔۔۔۔ الحمد للہ تھوڑی سی کوشش میں موٹر مل گئی۔ لباس بدل کر چار بجے میں اپنے ساتھ اپنے دونوں مصاحبوں کو لے کر ہوا خوری کے لیے نکلا۔ جہاں تک گیا اور دیکھا ناگپور کی بستی کو خوشنما پایا۔ سڑکیں سینۂ بے کینہ کی طرح صاف۔ اس کے دو رویہ گھنے درخت اپنے سایہ سے مسافر اور رہگذر پر سایہ ڈالتے ہیں۔ مکانات کی سجل باقاعدہ قطار۔ راستے وسیع۔ الغرض چلتے چلتے راجہ کے باغ کی طرف پہونچے جہاں شاہ صاحب رہتے تھے اور خبر کی کہ شاہ صاحب ہیں کہ نہیں۔ معلوم ہوا کہ موجود ہیں۔ فوراً میں اتر کر پہونچا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ زائرین کا تانتا لگا ہوا منتظر فضل باری ہیں اور مجذوب کے مظہر کو اپنا قاضی الحاجات سمجھ کر امید کا دامن پھیلائے ہوئے کھڑے ہیں۔ اور وہ مظہر ذات نامتناہی عبودیت کے خلعت سے شیین ہو کر مجذوب کی تصویر بن کر ہر ایک درد کی دوا کرنے میں اپنی مسیحائی دکھا رہا ہے جل جلالہٗ جل شانہٗ۔ اس وقت شاہ صاحب دوسری طرف متوجہ تھے۔ میرے پس پشت

کھڑے ہوتے ہی چونک کر فوراً میری طرف دیکھ کر نظر ملائی ۔۔۔ نظر کا ملنا تھا کہ میرے قلب پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ جس کا اظہار قلم سے ممکن نہیں۔ درحقیقت انکی نسبت نہایت قوی اور نظر میں برقی قوت تھی۔ میں نے بھی ان کی دید سے آنکھ نہیں چرائی۔ دس منٹ یا اس سے کچھ زائد عرصہ گزرا ہوگا۔۔۔۔ اس دید بازی کے مزے خوب ملے۔ اس کے بعد شاہ صاحب نے کہا "شرارتیں کرتے ہو جاؤ، جاؤ سیدھے گھر جاؤ"۔ میں سلام کر کے واپس ہوا۔ اگرچہ بعض کا خیال ہوا کہ میں ان سے کچھ کہوں مگر ان کی زبردست نسبت نے مجھے ہر طرح سے مطمئن کر دیا اور میں نے اپنے دل میں کہا کہ ؎

آئینہ کی مثال مرا سارا حال ہے پنہاں ہے بات کون سی روشن ضمیر سے

(شاد)

جب تھوڑی دور تک میں چلا تو میرے پیچھے ہی آئے اور ایک مائی صاحب بیٹھی تھیں ان سے چوڑی لی اور مجھے دیکھ کر کہا "لو، بس اب تو جاؤ گے"۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ مائی صاحبہ حضرت کی منکوحہ ہیں، اس وقت کی کہ جب یہ سلوک میں تھے واللہ اعلم۔ میں نے چوڑی لی اور اس کا تفاول بھی نیک خیال میں آیا۔ میں پھر سلام کر کے واپس ہوا۔ پھر میرے ساتھ آئے۔ میں کھڑا ہو گیا۔ کبوتر وہاں اڑ رہے تھے ان کی طرف مخاطب ہو کر درختوں کے کونڈوں میں سے کچھ مٹی اٹھائی اور کبوتروں کی طرف ڈال کے اور خدا جانے کیا بڑبڑاتے رہے۔ میں تو ان کی دید میں محو تھا۔ اللہ اللہ اس کی یکرنگی کے کیا کیا تماشے ہیں۔ سبحان اللہ

۔۔۔۔ اس اثنا میں ایک معتقد سگریٹ روشن کر کے شاہ صاحب کی طرف متوجہ ہوا۔ آپ نے فوراً میری طرف دکھا کر اس سے کہا کہ "یہ تو ان کو دو یہ پییں گے۔ ان کے واسطے چاہیے۔ اور وہ سگریٹ مجھ کو عنایت فرمایا۔ میں نے اس کو بھی لے لیا جب میں جانے لگا تو جیسے فوجی سپاہی سلام کرتے ہیں اس طرح سلام کر کے یہ الفاظ کہے

ALL RIGHT AND GOOD MORNING

یعنی سب کچھ بہتر ہے ۔۔۔ میں پھر سلام کر کے رخصت ہوا۔ پھر میرے ساتھ ساتھ وہاں تک آئے جہاں میں موٹر سے اترا تھا۔ وہاں سے وہ دوسری طرف چلے گئے اور میں خدا حافظ کہہ کر اپنے فرودگاہ کی طرف روانہ ہوا۔ ۔۔۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میرا سیلون ریل سے اٹاچ کروایا گیا۔ ملک صاحب نے پھول کے ہار پہنائے اور میوے کی کشتیاں تحفہ دیں۔ میں نے ان کا دل سے شکریہ ادا کیا۔ ادھر سیٹی ہوئی اور میں نے سب کو خدا حافظ کہا۔ شب بخیر ۔۔۔ دوسرے روز منماڑ پہونچا۔ وہاں بذریعہ تار اطلاع ہوئی کہ برخوردار کا مزاج روبہ اصلاح ہے۔ ڈاکٹر ہنٹ نے کہہ دیا کہ اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔ ٹمپریچر ایک سو ایک سے زیادہ نہیں ہے۔ الحمد للہ والمنہ اس نوید مسرت آمیز کے سننے سے دل شاد باغ باغ ہوا ۔۔۔ [1]

اس طرح علامہ اقبال کے مطلع کرنے سے قبل مہاراجہ سرکشن پرشاد مرد حق آگاہ حضرت بابا تاج الدین ناگپوری سے نہ صرف واقف تھے بلکہ ان کی زیارت بھی کر چکے تھے اور ان کے فیوض سے مستفیض بھی ہو چکے تھے۔

اقبال بنام شاد

مہاراجہ سرکشن پرشاد علامہ اقبال کے بہت قریبی دوست تھے وہ علامہ اقبال کے گرویدہ تھے۔ انہیں علامہ سے بے حد محبت و عقیدت تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ اقبال ان سے قریب آجائیں اور ریاست میں انہیں کسی معزز عہدے پر فائز کر دیا جائے۔ وہ انہیں اپنا سچا اور مخلص دوست سمجھتے تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ مہاراجہ نے اپنی اولاد کے شادی بیاہ کے معاملے میں علامہ اقبال سے بھی مشورے کیے۔ دیکھئے ۴م جنوری ۱۹۲۳ء کے خط

[1] سیر ناگپور۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد۔ محبوب پریس حیدرآباد دکن۔ ۱۳۳۱ھ۔ ص ۱ تا ۶۰۔

میں کس بے تکلفی اور اپنائیت سے لکھتے ہیں :

" یہاں لڑکے اچھے نہیں ملتے۔ تعلیم یافتہ ہے تو مالی حالت حیثیت اچھی نہیں۔ اگر مالی حیثیت اچھی ہے تو تعلیم ٹھیک نہیں۔ آپ نے میرا منشا پالیا اور میرے خیالات کا اندازہ کر لیا ۔۔۔ لڑکیوں کی شادی دور و نزدیک پر منحصر نہیں بلکہ ان کے آئندہ زندگی اطمینان و خوش حالی کے ساتھ گزرنے پر منحصر ہے "

اس کے بعد انہوں نے اپنی شادی شدہ لڑکیوں اور دامادوں کی کیفیت بیان کرنے کے بعد علامہ اقبال سے مشورہ طلب کیا ہے :

" اب آپ ان سب کی ہسٹری پڑھ کر جوڑے دیں گے اور بتا دیں گے کہ کون سے لڑکے ہیں اور کس حالت کے ہیں۔ اب دس لڑکیاں ہیں جن میں دو رانی زادیاں ہیں۔ ایک بالغ و ہشیار دوسری دو سال کی۔ آٹھ بیگم زادیاں ہیں جن میں ایک پانچ سال کی ہے، دوسری آٹھ سال کی۔ باقی دس اور بارہ کے درمیان میں تین ہیں اور چودہ اور انیس کے درمیان پانچ ہیں۔ مرحومہ بیگم کی بھی پانچ ہیں جن میں چار چودہ اور اٹھارہ کے درمیان اور ایک پانچ سات کے درمیان میں۔ دو کے متعلق حضور (نظام) کا خیال ہے کہ اپنے صاحبزادوں سے منسوب کریں واللہ اعلم۔ ابھی نقش برآب ہے۔ اگر دو ہے تو پھر تین کے لیے ضرورت ہے۔ غرض یہاں کے حالات کے لحاظ سے شاد ہر طرح مجبور اور بارگراں ہے۔ ہر طرح سبک دوش کس طرح ہو، اس فکر میں ہوں مگر بھروسہ مالکِ حقیقی پر ہے "

اقبال بھی مہاراجہ کو اپنا مخلص دوست اور ہمدرد سمجھتے تھے۔ وہ اپنا کوئی راز مہاراجہ سے پوشیدہ نہیں رکھتے تھے بلکہ اپنے عشق و محبت کی وارداتوں کا حال تک بیان کر دیتے تھے۔ دونوں

نہایت اخلاص سے ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے اور ایک دوسرے پر مکمل اعتماد کرتے تھے۔[1]

مہاراجہ سرکشن پرشاد مدارالمہام کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے لیکن ۱۹۱۲ء میں وہ اپنے منصب سے سبکدوش ہوگئے یا کردیے گئے تو ایک عرصے تک اس اعلیٰ عہدے پر ان کا انتخاب نہ ہوسکا۔ علامہ اقبال بھی اپنے دوست کی اس پریشانی سے بے چین تھے۔ جب انہیں صاحب حال وقال اور مجذوب مردحق آگاہ حضرت باباتاج الدین ناگپوری کے روحانی مرتبہ کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے دوست کی پریشانی کو دور کرنے کے لیے ایک درخواست (دعا) دربار تاج الاولیاء میں گزاری۔ چنانچہ اس تعلق سے علامہ اقبال اور مہاراجہ کشن پرشاد میں جو مراسلت ہوئی ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کو باباتاج الدین ناگپوری سے کس قدر عقیدت تھی۔

۱۱ اور ۲۷ اکتوبر ۱۹۲۱ء کے خطوط میں علامہ اقبال نے تاج الاولیاء باباتاج الدین ناگپوری کی خدمت میں حاضر ہونے کا قصد کا اظہار کیا تھا۔ مقصد مہاراجہ کے حق میں فیصلہ ہونے کی دعا کرانا تھا لیکن علامہ اقبال باباتاج الدین کی خدمت اقدس میں حاضر نہ ہوسکے مگر انہوں نے پیغام مراقبے کے ذریعے بھجوادیا۔ چنانچہ ۳ فروری ۱۹۲۲ء کے خط میں علامہ لکھتے ہیں:

"مولانا شاہ تاج الدین کی خدمت میں حاضر نہ ہوسکا۔ البتہ پیغام مراقبے کے ذریعہ بھیجا ہے مگر اقبال کے ٹیلی فون کی مشین ناقص ہے۔ دیکھیں پیغام وہاں پہنچا بھی ہے یا نہیں۔"

پھر علامہ ۲۲ فروری ۱۹۲۲ء کے خط میں مہاراجہ کو اطلاع دیتے ہیں:

"اگر شاہ تاج الدین صاحب کا پیغام مجھ تک پہلے پہنچ گیا تو انشاء اللہ عرض کروں گا۔ ایک اور جگہ سے بھی ایسے ہی پیغام کی توقع ہے۔ غرض کہ اقبال شاد سے غافل نہیں رہ سکتا۔"

[1] اقبال بنام شاد۔ محمد عبداللہ قریشی۔ ص۔ ۷۰۔

۱۱ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو علامہ نے مہاراجہ کو لکھا:

"کچھ عرصہ ہوا عرض کیا تھا کہ خاکسار نے جو پیغام مولانا شاہ تاج الدین صاحب کی خدمت میں بھیجا تھا اس کا جواب سرکار والا کی خدمت میں پہلے پہونچے گا۔ اخباروں سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ مطلوبہ جواب سرکار عالی تک پہنچ گیا ہے لیکن اقبال حضور سے سننے کے مشتاق ہے تصدیق ہوجائے تو مزید عرض کروں۔"

اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ اقبال کو دربار شاہ تاج الدین میں بھیجی گئی درخواست کے قبول ہونے کا یقین ہوچکا تھا اس لیے اخباروں میں یہ خبر گشت کررہی تھی کہ ایک دفعہ پھر مہاراجہ کو دکن کی صدارت عظمیٰ کے لیے منتخب کیا جانے والا ہے، علامہ اقبال نے اس پر یقین کرکے اپنے خط میں یہ قطعہ تاریخ بھی لکھ دیا تھا:

صدر اعظم گشت شاد نکتہ سنج — ناوک او دشمناں را سینہ صفت

سال ایں معنی سروش غیب داں — جان سلطاں سرکشن پرشاد گفت

۱۳۳۱ھ

اس خط کے جواب میں مہاراجہ نے علامہ کو لکھا کہ:

"آپ جو لکھتے ہیں کہ جو پیغام حضرت شاہ تاج الدین صاحب کی خدمت میں بھیجا تھا اس کا جواب فقیر شاد کو پہونچے گا، مگر کب تک پہونچتا ہے اس کا انتظار ہے۔ اس گیارہ سال میں ان حضرات نے جو گوشۂ تنہائی میں بیٹھے ہوئے سارے عالم اور اسرار الٰہی کی سیر میں مصروف ہیں اس قدر پیشین گوئیاں اس خاکسار کے متعلق ایسے تعجب خیز الفاظ میں کی ہیں کہ کہتے ہوئے جھجکتا ہوں۔ مگر خدا کی شان ایسی ارفع واعلیٰ ہے کہ باایں ہمہ ان لوگوں کو بھی خبر نہیں کہاں سے کیا سن کر کہا اور کیوں وہ پیشین گوئیاں ظہور میں نہیں آئیں۔ ہر پیشین گوئی بجائے خود راز ہی رہا.... تاج الدین بابا کا حکم اور پیشین گوئی

کیا ایسی ہی ہو سکتی ہے کہ جس کا ظہور نہ ہو؛ مگر وہ کیا بات ہے کہ آپ کو تو خیال ہے کہ مجھے اطلاع ہو چکی ہوگی، یعنی وہ منشا ظہور پذیر ہوا ہوگا۔ چنانچہ اسی خیال نے آپ کو اخباری احکام پر یقین کرایا اور آپ نے تاریخ تک لکھ بھیجی اور یہاں بقول کسے:

ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے ... بہر حال مجھے اطلاع ہونے کا ثبوت کیا ہے؟ اسکی صراحت کیجئے۔ یہ اور بات ہے کہ:

بڑھا دیتا ہوں ہم جنسوں کا رتبہ | مثالِ نقطہ گوہے کار ہوں میں
تامل سے مجھے دیکھو تو جانو | کہ اک گنجینۂ اسرار ہوں میں

پیارے اقبال! یہاں نہ وزارت ہے نہ صدارت۔ ہاں اخباری دنیا میں اور پبلک کی زبانوں پر سب کچھ ہے۔ انقلاب عالم کے ذاتی تجربے نے فقیر شاد کو ہستیِ انسانی کا ایک راز بنا رکھا ہے۔ آپ کا قطعہ آپ کی اخلاص مندی کا ایک آئینہ ہے فقیر اس کو اس وقت تک محفوظ رکھتا ہے جب تک کہ پردۂ راز سے معشوق کامرانی کی جلوہ نمائی ہو۔ وقت پر سب کچھ ہوگا۔ اس کو خلق عالم کی زبان کو نقارۂ خدا سمجھے ہوئے ہوں۔" (مکتوب شاد محررہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۲۲ء) [1]

مہاراجہ کشن پرشاد، ۸ جمادی الاول ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۶ء کو دوبارہ دکن کے مدار المہام ہوئے لیکن اس کی افواہ تین چار سال پہلے ہی اڑ گئی تھی اور علامہ اقبال نے اس پر یقین کر کے قطعۂ تاریخ بھی لکھ دیا تھا اور باباتاج الدین کے دربار میں کی گئی درخواست کا جواب سیدھا شاد کو پہونچنے کی خوش خبری بھی سنائی تھی لیکن یہ خبر "افواہ" ثابت ہوئی۔ شاد پچھلے ۹ سال سے کسی عہدے پر نہ تھے، بیکار تھے۔ اسلیے پریشان تھے۔

[1] ایضاً۔ ص ۳۵۱-۳۵۲۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۲۲ء کے خط میں علامہ اقبال نے مہاراجہ کو لکھا:

"اخبارات میں تو (خالصہ، ایڈووکیٹ، پیسہ اخبار وغیرہ) وہی دیکھا ہے جو میں نے عرض کیا تھا مگر پرسوں سر محمد شفیع صاحب سے معلوم ہوا کہ ابھی آخری فیصلہ نہیں ہوا، سر محمد شفیع علی گڑھ گئے تھے، وہاں مسٹر حیدری بھی موجود تھے۔ یہ روایت کی کہ ابھی کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہوا... بہر حال اللہ تعالیٰ کی درگاہ سے امید ہے کہ حسب مراد ہوگا... رات پھر ایک اور پیغام حضرت تاج کی خدمت بابرکت میں بھیجا گیا ہے..."

پھر مہاراجہ نے علامہ اقبال کو ایک خط میں لکھا:

"آج ایک خط بابا جمال الدین صاحب کا (یہ صاحب باباتاج الدین کے مرید خاص سمجھے جاتے ہیں جو نئی بات ہے کہ مجذوب کا کوئی مرید نہیں ہوا اور نہ مجذوب کسی کو مرید بناتا ہے، بنایا تو اپنا سا البتہ بنایا، بہر حال وہ پانچ چھ مہینے قبل یہاں آئے تھے) دربار تاج الاولیا سے فقیر کو وصول ہوا جس کے آخری الفاظ یہ ہیں:

"... زبانی یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اس کو بلاؤ۔ لہذا تم بدیدن خط ہذا حاضر دربار ہونے کی تیاری کرو۔"

فقیر شاد متحیر ہے کہ کیا کرے۔ جائے یا نہ جائے۔ اگر آج کل کی خبروں کو پیش نظر رکھ کر وہاں جاتا ہے، تو کہنے والے یہی کہیں گے کہ امید اخبار کی تائید کو گئے ہیں۔ نہیں جاتا تو ان کی یاد فرمائی کی (اگر حقیقتاً ہونے کی صورت میں) عدول حکمی ہوتی ہے۔ بلائے ذوقت لیلیٰ و صحبت لیلیٰ کا مضمون ہے۔ اس بارے میں آپ کا مشورہ کیا ہے؟ یوں تو بقول آپ کے میں نے بھی عرضی بھیجی کہ اگر بلانا ہے تو سامان ویسے کر دیجئے کہ اعتراض نہ کریں۔ اس کا جواب ابھی تک نہیں آیا۔" (محررہ یکم نومبر ۱۹۲۲ء)

۱۱ نومبر ۱۹۲۲ء کے خط میں علامہ اقبال نے شاد کو لکھا:

"باباتاج الدین کے پیغام سے میری مراد معشوق کامرانی کا خیال ہے۔ جب سرکار کو یہ پیغام موصول

ہو تو دربار تاج میں تشریف لے جائیے۔ فی الحال سرکار والا کا تامل بالکل بجا ہے اور جو کچھ سرکار
نے جمال صاحب کو لکھا ہے مناسب ہے۔ میں نے جو عرض کیا تھا کہ باباتاج کا پیغام مجھ سے پہلے
سرکار کی خدمت میں پہونچے گا اس سے مراد ..... ہے۔"

علامہ کے خط کے جواب میں شاد نے لکھا:

"جس روز تاج الملتہ والدین کے حکم کے مطابق آپ کو خط لکھا ہے اسی روز یا شاید اس کے
دوسرے روز باباجمال الدین صاحب ناگپور سے یہاں آئے۔ انہوں نے بھی وہی کہا جو آپ کو
خط میں لکھا گیا ہے اور وہی جواب دیا گیا ہے کہ اگر حضرت کو فقیر شاد کے لیے حکم حضوری ہے تو
باطنی کشش کی ضرورت ہے۔ ورنہ ظاہری احکام پر پنجگاہ خسروی میں رخصت کی درخواست
پیش کرنا اور وہاں سے رخصت کی منظوری ہونا نہ ہونا اور پھر اس رخصت طلبی پر خیالات
کا طوفان اٹھنا یہ ایک محال اور خلاف مصلحت ہے۔ دو تین روز باباجمال الدین صاحب
یہاں مہمان رہ کر واپس گئے ہیں اور یہ کہہ کر گئے ہیں کہ وہاں پہونچتے ہی احکام حاضری جاری
کراؤں گا۔" (محررہ ۱۹ نومبر ۱۹۲۲ء)

پھر ۱۳ مارچ ۱۹۲۳ء کو شاد نے علامہ اقبال کو لکھا:

"آپ تو حضرت تاج الاولیا بابا تاج الدین صاحب کی خدمت میں ٹیلی فون بھیجتے ہی رہے۔
اس کے جواب باصواب کا آغاز کرتے ہی رہے، یہاں تک کہ اس کے نتیجے کا بھی مجھے بے چینی کے
ساتھ انتظار رہا اور ہے۔ مگر نہیں، میں نے غلطی کی۔ ٹیلی فون کا جواب خطاب سر دربار تاج
سے ملا اور جب سر کا خطاب ملا ہے تو تاج بھی ملے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ میرے منتظم پیشی سید
صادق حسین غبار جو رخصت لے کر اس طرف گئے تھے چونکہ ناگپور راستے میں تھا وہاں بھی گئے
اور پندرہ سولہ روز تک وہاں رہے۔ باباصاحب کے دربار کے جو واقعات انہوں نے بیان

کیے وہ حیرت افزا ہیں۔ وہ بیان کرتے تھے کہ چوبیس گھنٹے میں ایک منٹ کے لیے بھی ایسا نہیں
جس میں باباصاحب تنہا ہوں۔ سواری کے وقت سینکڑوں عورت و مرد کا ہجوم سواری کے
گرد ہوتا ہے۔

غبار صاحب نے وہاں پہونچنے کا مجھے ایک تار دیا جس کا جواب ان کو دیا گیا۔ اس میں
باباصاحب کو آداب عرض کیا تھا۔ انہوں نے وہ تار باباصاحب کو دیا۔ جواب میں فرمایا کہ بارہ بجے
اس کا جواب دوں گا۔ تار اپنے پاس رکھ لیا۔ دوسرے روز بارہ بجے ایک صحرا میں وہی تار ایک
آم کے ہرے بھرے درخت پر تین بار لگا کر ایک تنکے سے اس پر کچھ لکھا اور تین مرتبہ اللہ اکبر کہا
(یہ آواز فتح ونصرت کی آواز ہے) اس کے بعد بھی "ٹوپی پہن کر اوڑ" کئی روز تک کہا۔ بہرحال
مثل اس کے اور بھی واقعات ہیں جن کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو انوار واسرار بزرگان سے واقف ہیں۔
غبار صاحب کہتے ہیں کہ پہلے دن پہلی دفعہ جب سامنا ہوا ہے تو اول تو دور ہی سے ڈانٹ بتائی
یہ وہاں سے ہٹ کر دوسری طرف سے آئے تو دیکھتے ہی ان کی طرف دیکھ کر کہا "پہلے تو گدی پر
بٹھادیا، اب کھینچتا ہے، چلاتا ہے، بکتا ہے" واللہ اعلم کیا معاملات ہیں۔"

۱۹ مارچ ۱۹۲۳ء کو اس خط کا جواب دیتے ہوئے علامہ اقبال نے لکھا:

"ٹیلی فون کا سلسلہ جاری ہے اور کئی اطراف میں۔ اطمینان فرمائیے۔ خدا نے چاہا تو نقش حسب
مراد بیٹھے گا۔"

۲۴ مارچ ۱۹۲۳ء کے خط میں شاد پھر علامہ کو لکھتے ہیں:

"اس سے قبل ۱۳ مارچ ۱۹۲۳ء کو ایک خط آپ کی خدمت میں بھیجا گیا تھا جس میں غبار صاحب
منتظم پیشی کے ناگپور جانے اور باباتاج سے ملنے کی کیفیت درج تھی۔ غالباً وہ خط آپ کو ملا
ہوگا۔ مگر اس زیر جواب خط میں اس کے متعلق کوئی اشارہ نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ وہ خط

بعد میں پہونچا ہو۔ فقیر شاد کے لیے باعث شادکامی ہوگا اگر اس خط کے رموز و نکات و اسرار کا آپ انکشاف فرمائیں گے۔ رمضان کے بعد تاج الاولیا ر نے فقیر کو اپنی حضوری میں بلانے کا اشارہ کیا ہے۔ واللہ اعلم کیا ظہور میں آنے والا ہے"۔

جس وقت مہاراجہ کے وارث اور جانشین خواجہ پرشاد کے اچانک گرنے اور آنکھ کے نیچے ایک کیل چبھ جانے سے زخم ہوا تو نا قابل برداشت تکلیف ہونے لگی۔ آنکھ تو بچ گئی لیکن بصارت کو نقصان پہنچا، اس مصیبت کے وقت میں انہوں نے بابا تاج الدین سے خواہش دعا کی۔ چنانچہ علامہ کو ایک خط لکھا کہ:

"آپ اپنے مختص اوقات میں دعا کیجئے اور اگر وہاں کوئی سالک مجذوب بزرگ ہوں تو ان سے دعائے صحت کے لیے خواہش کیجئے۔ یہی دعا کہ بصارت و بینائی بدستور آجائے ۔۔۔۔ میرے منتظم میجی سید صادق حسین غبار ناگپور گئے تھے۔ حضرت تاج الاولیا بابا تاج الدین سے خواہش دعا کی تو فرماتے ہیں۔ آنکھ اچھی ہے۔ خواجہ پرشاد دھرم راجہ ہیں۔ میں اسکے ساتھ ہوں۔ وہ میرے ساتھ ہے وغیرہ"۔

خطوط مندرجہ بالا کے اقتباسات حضرت بابا تاج الدین ناگپوری سے علامہ اقبال اور مہاراجہ سرکشن پرشاد کی عقیدت کے آئینہ دار ہیں۔

حضرت بابا تاج الدین ناگپوری کے حالات زندگی

بابا تاج الدین برصغیر ہند و پاک کے مشہور اولیائے کرام میں سے ہیں۔ ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، بودھ، عیسائی اور دلت سب آج بھی ان کے آستانے پر ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر راجندر پرشاد، وی وی گری، جسٹس ہدایت اللہ، راجیو گاندھی اور دیگر مشاہیر ان کے دربار میں حاضری دے چکے ہیں۔

حضرت بابا ذہین شاہ تاجی نے نہایت عقیدت سے اپنے مرشد کے مرشد حضرت بابا تاج الدین

ناگپوری کا ایک مفصل تذکرہ "تاج الاولیاء" کے نام سے لکھا ہے۔ ذیل میں حضرت بابا تاج الدین کے حالات زندگی اسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

حضرت سید محمد بابا تاج الدین ۱۲۶۸ھ (۵۲-۱۸۵۱ء) میں پیدا ہوئے "چراغ دین" آپ کا تاریخی نام ہے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حسنی و حسینی ہے۔ خود حضرت بابا صاحب کا بیان ہے کہ میں امام حسن عسکری کا پوتا ہوں۔ آپ کے آباؤ اجداد عرب سے آکر مدراس میں آباد ہوئے۔ آپ کے والد محترم جو فوج میں ملازم تھے جن کا اسم گرامی بدر الدین تھا، اسی پلٹن کے ساتھ تبادلہ ہو کر کامٹی (ناگپور) آئے۔ آپ شکم مادری ہی میں تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور یہیں ۱۲۶۸ھ میں آپ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ دو ڈھائی برس کے ہوئے تو والدہ بھی آپ کو خدا کے سپرد کر کے رخصت ہوگئیں۔ نانا نے سر پر دست شفقت رکھا اور مکتب میں بٹھایا، مگر آپ کا رجحان بچپن ہی سے عبادت و ریاضت کی طرف تھا سیر و تفریح سے کوئی دلچسپی نہ تھی، پھر بھی آپ نے اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کی تکمیل کی۔ بڑے ہو کر آپ نے بھی اپنے بزرگوں کی روایت کے مطابق فوجی ملازمت اختیار کی۔ ایام جوانی میں پلٹن میں تین سال تک ملازمت کی۔ دوران ملازمت ناگپور کے قریب کامٹی ملٹری کیمپ (میگزین) میں اسلحہ کے ذخیرے پر پہرہ دینے کے لیے متعین تھے۔ پھر ترک ملازمت کر کے سلوک باطن کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ کم گو اور کم آمیز تھے۔ کم کھاتے اور کم سوتے تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت آپ کا محبوب مشغلہ تھا عبادت، ریاضت اور مجاہدہ آپ کی فطرت ثانیہ بن چکا تھا۔ روحانی سرشاریوں میں جسمانی تقاضوں کو بھلا دیا تھا۔ رفتہ رفتہ آپ کا جسم بھی روحانی انوار کی جلوہ گاہ بن گیا اور آپ مرکز جذب و کشش ہو گئے۔

ذہین شاہ تاجی نے لکھا ہے کہ بابا کی نسبت ابتداءً قادری ہے۔ حضرت عبداللہ شاہ قادری جن کا مزار کامٹی میں ہے اور جو ایک صاحب باطن بزرگ تھے اوائل عمر میں بابا نے ان سے استفادہ کیا تھا پھر سلسلہ چشتیہ صابریہ میں آپ کی نسبت حضرت داؤد مکی قطب جہاں سے ہے۔ جن کا مزار پر انوار

ساگر (سی۔ پی) میں ہے۔ حضرت داؤد مکی سلسلہ چشتیہ کے مشہور بزرگ حضرت شمس الدین ترک پانی پتی کے مرید و خلیفہ ہیں۔ حضرت داؤد مکی کے مزار پر حضرت باباصاحب نے بہت سی ریاضتیں اور مجاہدے کیے تھے۔

حضرت باباتاج الدین پر عالم جذب و سرمستی کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ اس جذب و سرمستی کی کیفیت کی بنا پر ابتداً رمز شناس لوگ آپ کو چھیڑتے اور تنگ کرتے تھے لیکن جوں جوں حقیقت سامنے آتی گئی مخلوق خدا اور عوام کو اپنی غلطی محسوس ہونے لگی۔ یہاں تک کہ آپ مرکزِ عقیدت خلائق بنے۔ آخر وہ وقت بھی آیا جب آپ کی خدمت میں ہزاروں عقیدت مند حاضر ہوتے تھے اور اکتساب فیض کرکے جاتے تھے۔

کچھ دن آپ ناگپور اور کامٹی میں قلندرانہ گھومتے رہے۔ پھر یکایک ایک طویل عرصے کے لیے غائب ہوگئے۔ یہ زمانہ آپ نے جنگلوں میں گزارا جہاں بھیل اور گونڈ جیسی وحشی قومیں آباد تھیں۔ وہ لوگ آپ کے گرد جمع ہوگئے اور پوجنے لگے مگر آپ نے ان کو راہِ حق دکھائی۔ ایک مدت بعد پھر ناگپور میں نمایاں ہوئے۔ یہاں ہجوم سے تنگ آکر پاگل خانے میں چلے گئے مگر وہاں بھی دربار قائم ہوگیا۔ اسی زمانے میں شہر ناگپور کا مشہور و معروف گونڈ راجہ رگھوجی راؤ بھونسلہ جس کو حکومت برطانیہ نے سالانہ نقد وظیفہ کے علاوہ شکر درہ، واکی وغیرہ کئی گاؤں جاگیر میں دیے تھے آپ کی بعض کرامات کا غیر معمولی معتقد ہوگیا۔ وہ آپ کو بگھی میں سوار کرکے پاگل خانے سے اپنے محل شکر درہ میں لے گیا۔ وہاں بھی زائرین نے پیچھا نہ چھوڑا۔ آپ نے جنگل کے قریب واکی گاؤں میں جو دریا کے کنارے واقع تھا ڈیرہ جمالیا۔ ایک حصے کو شفاخانہ قرار دیا، ایک حصے کو مسجد اور مدرسہ بنا دیا۔ طالبان حق ہر وقت جمع رہنے لگے۔ آپ کا چلہ خانہ، مسجد، شفاخانہ اور مدرسہ آج بھی واکی گاؤں میں موجود ہیں۔

تاج الاولیا میں آپ کی بہت سی کرامات کا تذکرہ کیا گیا ہے جنھیں تفصیل سے اس کتاب میں دیکھا جاسکتا ہے۔ باباصاحب اپنے مریدین و معتقدین کی تربیت و تزکیہ نفس کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ لوگ اصلاح اعمال کا تو اہتمام کرتے ہیں لیکن اصلاح نفس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ نفس کی جڑ کامل تلوار کے بغیر نہیں کٹتی۔ فرمایا کرتے تھے کہ برائی ہو یا بھلائی ہزاروں پردوں میں چھپ کر کی جائے تو بھی نہیں چھپتی۔ تربیت اور معاملات میں سب مریدین و معتقدین کے ساتھ یکساں سلوک فرماتے تھے۔ آپ کے فیوض و برکات کی بارش ہر خاص و عام پر یکساں برستی تھی۔

حضرت باباتاج الدین نے ۲۶ محرم ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۷ اگست ۱۹۲۵ء بروز دوشنبہ بوقت مغرب شکر درہ میں وصال فرمایا۔ رگھوراؤ راجا آپ کو شکر درے میں دفنانا چاہتا تھا مگر نواب نیاز الدین خاں نے بیربٹ (تاج آباد) میں آپ کی تدفین کے لیے ایک پلاٹ کی پیش کش کی اور اعلان کیا کہ وہ عنقریب یہ پورا موضع آپ کی درگاہ کے لیے وقف کردیں گے۔ چنانچہ مریدین و معتقدین کی اتفاق رائے سے آپ کو موضع بیربٹ (تاج آباد) میں دفن کیا گیا مولوی نجم الدین کابلی، محمد فرید خاں فضا اور حسن نامی ایک شخص نے غسل دیا۔ نماز جنازہ مولوی محمود علی ندوی نے پڑھائی، مولوی نجم الدین اور حکیم سید ظفر حسین نے جسد مبارک کو لحد میں اتارا۔ جنازے میں ہزاروں انسانوں نے شرکت کی۔ ملک کے اخبارات و جرائد نے اپنے اخباروں اور رسالوں میں آپ کی وفات حسرت آیات پر تعزیتی نوٹ لکھے۔ آپ کا سالانہ عرس ہر سال ۲۲ محرم سے ۲۹ محرم تک تاج آباد میں منایا جاتا ہے۔ آج بھی لاکھوں افراد اس میں شریک ہوتے ہیں۔ موجودہ مقبرہ کی تعمیر میں سب سے پہلا چندہ نظام حیدرآباد نے ۳۶ ہزار دیا اور عمارت کا نقشہ جناب نیا یار جنگ حیدرآباد نے تیار کیا تھا[1]

---

[1] اقبال کے محبوب صوفیہ از اعجاز الحق قدوسی ص ۵۱۲ تا ۵۱۹، اقبال بنام شاد۔ مرتبہ عبداللہ قریشی ص ۲۶۱ تا ۲۶۲۔

اردو کے صوتی امتیازات

از جناب رضوانہ معین صاحبہ*

اردو کو ہندوستان کی دوسری زبانوں سے منفرد اور جداگانہ حیثیت عطا کرنے میں عربی کے صوتیاتی نظام کا خاص حصہ ہے۔ فارسی ژ کے علاوہ چند مخصوص آوازیں (ز۔ ذ۔ ظ۔ خ۔ غ۔ ف۔ ق) جو عربی سے مستعار ہیں، اردو زبان کے تلفظ میں صوتی انفرادیت کے سبب امتیازی شناخت رکھتی ہیں، زبان کے مطالعہ سے ہمیں یہ علم ہوتا ہے کہ اردو نے اپنے ابتدائی اور تشکیلی دور میں ہی عربی و فارسی الفاظ کے ساتھ ان آوازوں کو قبول کر لیا تھا۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی لکھتے ہیں:

"اردو میں فارسی (بشمول عربی) کے عناصر کی موجودگی کی بدولت اس میں بہت سی بدیسی آوازیں شامل ہوگئیں مثلاً۔ ز۔ خ۔ ش۔ ژ حتی کہ عربی کی ہمزہ اور ع بھی (کم از کم فارسی اور عربی کے عالموں کی زبان میں) یہ ان الفاظ کی وجہ سے ہوا جن میں وہ آوازیں شامل تھیں اور جو بڑی تعداد میں در آرہے تھے"[1]

جب کسی غیر ملکی زبان کے الفاظ کثیر تعداد میں کسی زبان میں داخل ہونے لگتے ہیں تو اسکے کیا اثرات ہوتے ہیں اسے جناب وینرخ سے سُنیئے:

"جب ایک ہی زبان سے متعدد دخیل الفاظ کا ملاً یا جزواً غیر منقسم صوتی ہیئت میں کسی

* کیرآف عربک ڈیپارٹمنٹ سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لنگویجز، حیدرآباد۔

[1] ہند آریائی اور ہندی، مترجم عتیق احمد صدیقی، اردو ترقی بورڈ سن اشاعت ۱۹۷۷ء ص ۱۰۰۔

دوسری زبان میں راہ پاتے ہیں تو اس کے نتیجے میں مستعار لینے والی زبان کی آوازوں میں تبدیلیوں کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں"[1]

کچھ ایسی ہی بات بلوم فیلڈ نے بھی کہی ہے:

"اگر مستعار لینے والی زبان بولنے والی معطی زبان سے نسبتاً زیادہ مانوس ہوں یا اگر (اس مستعار لینے والی زبان میں) دخیل الفاظ کافی تعداد میں پائے جائیں تو ایسی غیر ملکی آوازیں جو دیسی آوازوں سے کافی بعید ہوتی ہیں کم و بیش صحت کے ساتھ مستعار لینے والی زبان میں باقی رکھی جاتی ہیں جس سے اس کا صوتیاتی نظام متاثر ہوتا ہے۔ یہ نئی آوازیں قبول کر لیے جانے کے بعد مستعار لینے والی زبان میں اپنی مستقل جگہ بھی بنا سکتی ہیں"[2]

دراصل بیرونی آواز والے الفاظ کا مستقل داخلہ کسی زبان میں صوتیاتی نظام کی تبدیلی کا محرک بن جاتا ہے۔ اردو کے تعمیری دور میں عربی اور فارسی کے الفاظ کثرت سے داخل ہوتے رہے اور ان الفاظ کے سہارے انکی مخصوص آوازیں جو ہند آریائی زبانوں کی صوتیات سے بالکل مختلف تھیں اس غیر مانوس ماحول میں اپنی جگہ بنانے لگیں۔ ہندوستان کی لسانیاتی فضا میں گو یہ آوازیں نئی اور اجنبی تھیں مگر اردو نے انہیں شرف قبولیت بخشی اور اپنے صوتیاتی نظام کا خاص جز بنایا۔ ان میں سے خ۔ ز۔ غ۔ ف۔ ق۔ مخارج اور انکی ادائیگی پر اہل اردو پوری قدرت رکھتے ہیں البتہ ث، ح، ض اور ع کے مخارج اور انکی ادائیگی پر سب ہی لوگ مکمل طور پر قابو نہیں پا سکتے ہیں۔ مگر پھر بھی افہام و تفہیم اور املائی صحت کے لیے تحریری شکل میں ان کو برقرار رکھنا ضروری سمجھا گیا ہے۔

[1] LANGUAGES IN CONTACT بحوالہ ڈاکٹر عصمت جاوید، اردو پر فارسی کے لسانی اثرات

[2] LANGUAGE BLOOMFIELD بحوالہ ڈاکٹر عصمت جاوید۔ اردو پر فارسی کے لسانی اثرات: تصوف کے آئینے میں، ص ۱۹۲۔

رفتہ رفتہ یہ آوازیں اتنی مانوس ہوگئیں کہ دیسی الفاظ میں بھی نفوذ کر گئیں۔ اس بارے میں پروفیسر گیان چند جین لکھتے ہیں:

"جب بیرونی آواز والے الفاظ حمولی زبان میں کافی تعداد میں آجاتے ہیں تو وہ آوازیں بعض دیسی الفاظ میں بھی داخل ہو جاتی ہیں، مثلاً خچر، غنڈہ، اخروٹ، غٹاغٹ، غڑغوں، غڑاپ جیسے الفاظ عربی فارسی کے نہیں لیکن ان میں خ یا غ بولی جاتی ہے، گنڈہ اور گپ دو لفظوں کے اصل تلفظ کو بدل کر غنڈہ اور غپ کر دیا گیا۔"[1]

یہ کوئی حیرت کی بات نہیں، ہر زبان دوسری زبانوں سے استفادہ کرتی ہے۔ اردو دنیا میں کوئی تنہا زبان نہیں ہے جس نے دوسری زبانوں اور صوتیات سے استفادہ کیا ہے، بلکہ کئی زبانیں ہیں جن میں انگریزی بھی ہے۔ انگریزی کے بارے میں ڈاکٹر عصمت جاوید نے بلوم فیلڈ کی بات نقل کی ہے:

"کس طرح اسکینڈینویائی خوشہ (SK) اور فرانسیسی صوتیے V Z اور AZ نہ صرف انگریزی زبان میں داخل ہوتے ہیں، انگریزی کے نئے وضع کردہ الفاظ میں بھی ان صوتیوں کا استعمال ہونے لگا۔"[2]

پچھلے باب میں گزر چکا ہے کہ اردو نے عربی کے سارے ہی حروف کو اپنایا ہے۔ اردو صوتیات میں ث۔ ص۔ ح۔ خ۔ ع۔ غ۔ ف۔ ق۔ ط۔ ز (ذ۔ ض۔ ظ) ایسے حروف ہیں جن کی آوازیں ہندوستان کی کسی دوسری ہند آریائی زبانوں میں نہیں ملتیں۔

کچھ آوازیں عربی میں گہری ہیں جن کو زور لگا کر ادا کیا جاتا ہے یعنی پیٹ اور حلق سے

---

[1] عام لسانیات، اردو ترقی بیورو، دہلی سن اشاعت ۱۹۸۵ء، ص ۳۶۵ [2] LANGUAGE BLOOM FIELD بحوالہ اردو پر فارسی کے لسانی اثرات، ص ۱۹۲۔

ادا کی جاتی ہیں انہیں حروف حلقی کہتے ہیں جیسے ع۔ ہ۔ ح۔ خ۔ ع۔ غ۔ مگر ان حروف کو اردو میں ہلکے انداز میں ادا کیا جاتا ہے۔ ہندی میں حروف حلقی نہیں ہیں۔

علامہ شبلی ان حروف کی آوازوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

ان میں بعض حروف ایسے ہیں جن کا تلفظ اور کوئی قوم نہیں کر سکتی مثلاً ع۔ ق۔ ص۔ ض۔ ط۔ ظ۔"[1]

معکوسی مصمتے ٹ ڈ ڑ خالص دراوڑی ہیں جو ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح اردو میں داخل ہوگئے ہیں۔ اس کے علاوہ باقی تمام آوازیں (مخلوط و غیر مخلوط) ہند آریائی ہیں۔[2]

اسی لیے ڈاکٹر رام آسرا راز لکھتے ہیں کہ:

"اردو رسم الخط میں بھی قریب قریب وہ تمام حروف موجود ہیں جو دیوناگری رسم الخط میں ہندوستانی زبانوں کی بنیادی آوازوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔"[3]

اس طرح اردو نے صوتیات کے معاملے میں دراوڑی، ہند آریائی، سامی (عربی) اور ہند ایرانی (فارسی) خاندان السنہ سے استفادہ کیا ہے اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اردو کا صوتی نظام دنیا کے ان چار بڑے خاندان السنہ کی صوتیات پر مشتمل ہے۔ اسی لیے پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

---

[1] ندوی، سید سلیمان، مقالات شبلی، جلد ۲، طبع پنجم ۱۹۶۴ء، معارف پریس اعظم گڈھ ص ۱ [2] خان، نطیر احمد ڈاکٹر، اردو ساخت کے بنیادی عناصر ۱۹۹۱ء دہلی ص ۱۴ [3] راز، رام آسرا، ڈاکٹر، اردو اور ہندی کا لسانیاتی رشتہ، بار اول ۱۹۷۵ء نئی دہلی، ص ۹۴۔

"اردو دنیا کی ان چند انتہائی متمول زبانوں میں سے ہے جن کا دامن اخذ و استفادے کے اعتبار سے ایک سے زیادہ لسانی خاندانوں سے بندھا ہوا ہے ۔۔۔۔۔ اردو صوتیات میں ایک پرت تو ہند آریائی آوازوں کی اور اس کے ساتھ ساتھ دراوڑی آوازوں کی ہے اور دوسری اتنی ہی اہم پرت مشرق وسطی کی زبانوں سے ماخوذ آوازوں کی ہے۔

اردو دنیا کی ان چند تہ دار زبانوں میں سے ہے جس میں متعدد منفرد اور ممتاز صوتی نظام ایک وسیع تر لسانی پیکر میں ڈھل کر بیک وقت کام کرتے ہیں۔ یہ کثیر لسانیت اردو میں ایسی وسعت، لوچ اور لطافت پیدا کر دیتی ہے جو دوسری ہند آریائی زبانوں کے لیے لائق رشک ہے۔"[1]

---

[1] نارنگ، گوپی چند، ڈاکٹر، املا نامہ، ص ۱۷ تا ۱۸۔

آثار علمیہ و تاریخیہ

مولانا شبلی نعمانی کی ایک نادر تحریر

مولانا شبلی کی یہ نادر تحریر ڈاکٹر شاہ عبدالسلام بحر یابادی استاذ شعبہ عربی لکھنؤ یونیورسٹی کو اپنے خاندانی کاغذات میں دستیاب ہوئی ہے جو ان کے تعارف کے ساتھ قارئین معارف کی نذر ہے۔ (ض)

"دراصل مولانا شبلی کی یہ نادر تحریر ایک سرٹیفکٹ ہے جو انہوں نے، فروری ۱۹۱۱ء کو پروفیسر عبدالقوی فانی ابن مولوی عبدالعلی آسی مدراسی کی سفارش کے لیے لکھا تھا، مولوی عبدالقوی فانی سابق پروفیسر فارسی لکھنؤ یونیورسٹی اپنے والد آسی مدراسی کے چار بیٹوں اور دو بیٹیوں میں سے تیسرے نمبر پر تھے (حکیم قاری عبدالولی۔ پروفیسر عبدالغنی۔ پروفیسر عبدالقوی فانی اور مولوی عبدالباقی اور دو بیٹیاں) فانی اپنی تعلیم کے زمانہ میں بی اے کرنے کے بعد انگلینڈ جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے نظام حیدر آباد کی خدمت میں مالی معاونت کے لیے ایک درخواست پیش کی تھی اس درخواست کے ساتھ مولانا شبلی کا یہ سفارشی خط بھی بھیجا گیا تھا۔

راقم الحروف کے دادا مولوی شاہ محمد جان بحری آبادی (ف ۱۹۲۰ء) مولانا تھانوی اور علامہ عبدالحی فرنگی محلی ابن مولانا عبدالحلیم فرنگی محل کے شاگرد اور مولانا شبلی اور مولانا عبدالعلی آسی مدراسی مولانا عبداللہ عمادی اور مولانا سید علی زینبی کے ہم درس[1] تھے۔ مولانا آسی مدراسی سے

---

[1] معارف: مولانا تھانوی سے موصوف کا تلمذ اور مولانا عبداللہ عمادی کا ہم درس ہونا محل نظر ہے، واقف کار حضرات سے اس پر روشنی ڈالنے کی درخواست ہے۔

مولوی شاہ محمد جان بحری آبادی کے بہت قریبی اور گھریلو تعلقات تھے اور آسی مرحوم کے مطبع اصح المطابع میں تصحیح کی بھی خدمت انجام دیتے تھے۔ شیخ مولوی عبدالعلی آسی مدراسی بن مولوی شیخ مصطفیٰ صدیقی حنفی چتوری انیسویں صدی کے آخری دور کے لکھنؤ کے نامور ادیبوں اور مستند عالموں میں شمار کیے جاتے تھے۔ علوم دینیہ میں بھی ماہر تھے اور فارسی و عربی زبان میں شعر و شاعری کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ اپنے والد کی طرح آسی کے چاروں بیٹے بھی تعلیم یافتہ اور اچھا علمی ذوق رکھتے تھے۔ خصوصاً مولوی عبدالقوی فانی نے فارسی ادب میں بڑا نام پیدا کیا۔ مولانا شبلی کا یہ سرٹیفکٹ مولوی فانی کی ذہانت اور علمی ذوق کی تصدیق ہے۔

مولانا شبلی کی یہ تحریر غیر مطبوعہ ہے اسے معارف میں پہلی بار شایع کیا جاتا ہے۔

مولوی عبدالقوی صاحب بی اے کو جو سرٹیفکٹ ان کے اساتذہ
اور سکرٹری کالج نے دیے ہیں ان کے بعد اگرچہ میری تصدیق
بکار چیزے نیست لیکن بطور واقعہ کے میں اظہار کرتا ہوں کہ وہ
نہایت لائق، ذہین، قابل شخص ہیں انشا پردازی میں
ان کو خاص مذاق ہے، اور تاریخ کے ساتھ ان کو
نہ صرف مناسبت بلکہ شغف ہے چونکہ وہ فطرۃً علمی
مذاق رکھتے ہیں اس لیے ان کا علمی اشتغال میں مصروف

ہونا قوم اور ملک کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔

ان کی تحصیل و تکمیل علم کے لیے یورپ جانا چاہیے بنا اور درحقیقت
ان کا یورپ جانا بہت مفید ہوگا اور اس لیے ان کو مدد دینا
ایک علمی خدمت ہے

شبلی نعمانی
۷ فروری سنہ ۱۹۱۱ء
لکھنؤ

معارف کی ڈاک

تصحیح نامے

(۱)

مکرمی جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب! السلام علیکم

موقر مجلہ "معارف" کا شمارہ بابت جنوری ۱۹۹۹ء موصول ہوا، اس میں میرے مضمون "گوشوارہ کلیات اقبال" میں کچھ غلطیاں ہوگئی ہیں، پہلی غلطی تو کاتب کی ہے اور باقی تین میری۔ تصحیح شایع کردیں تاکہ قارئین معارف انہیں درست کرلیں۔

خاکسار محمد بدیع الزماں

فرسٹ سیکٹر، پھلواری شریف۔ پٹنہ

(۱) گوشوارہ "بانگ درا" (صفحہ ۶۲) سطر ۱، گوشوارہ "ضرب کلیم" (صفحہ ۶۴) سطر ۱۶، گوشوارہ "ارمغان حجاز" (صفحہ ۶۵) سطر ۵، اور گوشوارہ "کلیات اقبال" (صفحہ ۶۵) سطر ۹۔ ہر جگہ پہلے خانوں میں عنوان "نظمین" غلطی سے "تضمین" چھپ گیا ہے۔ تصحیح کرلیں۔

(۲) صفحہ ۶۲ سطر ۱ پر "بال جبریل" کے تضمین کے اشعار کی تعداد ۳۳ اور "ارمغان حجاز" (سطر ۱۱) کی ۲ تصحیح کی جائے، اور تضمین کے کل اشعار (سطر ۱۲) کی تعداد ۵ کے بجائے ۶۱ تصحیح کی جائے۔

(۳) گوشوارہ بال جبریل صفحہ ۶۳ سطر ۴ کے آخر میں یہ اضافہ کردیا جائے (۲) "یورپ سے ایک خط" (رومی)۔

(۴) گوشوارہ "ارمغان حجاز" سطر ۷ کے بعد اور گوشوارہ کلیات اقبال سے پہلے تضمین کے دو اشعار یہ نقل کیے جائیں۔

(۱) "سعود مرحوم" (سعدی) (۲) "ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض" آخری بند۔ (جان جاناں مظہر)

(۲)

کرم فرمائے رئیس زیدت معالیکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جنوری ۱۹۹۹ء کا معارف پرسوں ہم نظر ہوا، میری نعت کے دوسرے شعر کے دوسرے مصرع میں لفظ "دشت" کے شین کے نقطے کتابت سے رہ گئے ہیں جس سے مفہوم میں فرق آئے گا۔ تصحیح کرلی جائے۔ طالب دعا: رئیس احمد نعمانی۔

۴/۱۱۸ A لوکو کالونی۔ علی گڑھ

وفیات

جناب جی۔ عبدالرشید صاحب

میں ۱۹۸۰ء کے آخر میں پہلی مرتبہ مدراس گیا تھا، اس کی اطلاع اپنے کرم فرما اور دارالمصنفین کے سابق رفیق افضل العلماء الحاج مولانا محمد یوسف کوکن عمری کو پہلے کردی تھی ان کے پیر میں چوٹ آگئی تھی اور صاحب فراش تھے اس لیے انہوں نے نیو کالج کے عربی کے لکچرر جناب جی۔ عبدالرشید صاحب کو بھیجا کہ وہ اپنے ہمراہ مجھے ان کے دولت خانہ پر لے آئیں، گیا تو کوکن صاحب نے دوسرے روز کھانے پر بلایا، چنانچہ عبدالرشید صاحب کے ساتھ وہاں گیا، اب وہ میرے ساتھ سایہ کی طرح ہوگئے۔ اپنے یہاں کھانے پر بھی مدعو کیا، مدراس کے تمام قدیم و جدید تعلیمی اداروں، قابل دید مقامات اور ساحل سمندر کی سیر کرائی۔ معارف کے خود خریدار بنے اور مزید خریدار بنانے کا وعدہ کیا۔ مدراس اسٹیشن چھوڑنے آئے۔

عبدالرشید صاحب سے گاہے ماہے خط و کتابت رہتی تھی۔ ابھی نومبر میں دارالسلام عمرآباد جانے کا پروگرام بنا تو انہیں اور جناب عبیداللہ صاحب کو خطوط لکھے کہ آپ لوگوں سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے۔ عبدالرشید صاحب نے جواباً تحریر فرمایا:

"خوشی ہوئی کہ مدت دراز کے بعد آپ سے ملنے کا موقع مل رہا ہے آپ مدراس تشریف لائیں اور طاقات نہ ہو، نیو کالج میں ہفتے میں دو دن دینیات کے کلاس منعقد ہوتے ہیں جس میں صوم وصلوٰۃ اور اخلاقیات کے موضوع پر درس دیا جاتا ہے اس سال اس کورس پر دو کتابیں انگریزی میں شایع ہوئی ہیں۔ کالج کی تعطیلات کے بعد دسمبر پہلی تاریخ کو کھل رہا ہے انشاء اللہ ۲ تاریخ کی صبح ان کتابوں کی اجرا کے لیے ایک جلسہ صبح میں منعقد کیا گیا ہے۔

آپ کی شرکت اس جلسے میں ہمارے لیے باعث برکت ہوگی اور کتابوں کا اجرا آپ کریں باعث سعادت ہوگا۔"

ان کا گرامی نامہ میری روانگی کے بعد آیا اس لیے اس تقریب میں شریک نہیں ہو سکا، تاہم عبدالرشید صاحب اور عبید اللہ صاحب اسٹیشن پر موجود تھے اور طے پایا کہ رات کا کھانا عبدالرشید صاحب کے یہاں ہوگا، وہاں پہنچا تو پورا گھر فرش راہ بنا ہوا تھا، اپنے صاحبزادوں اور بھائی وغیرہ سے ملایا اور بڑے لطف و محبت سے پیش آئے۔

عبدالرشید صاحب بڑے نیک طبع، شریف متواضع مخلص، دیندار اور دردمند شخص تھے، علم و فن کے دلدادہ اور اہل علم سے بڑا تعلق رکھتے تھے پہلے کیمسٹری کے لکچرر تھے مگر عربی زبان اور اسلامی علوم سے شیفتگی کی بنا پر مسلم یونیورسٹی سے عربی میں ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کیا اور اب اسی شعبہ سے وابستہ تھے اور اسی سال ریٹائر ہونے والے تھے۔ دارالمصنفین سے والہانہ تعلق تھا، خیال تھا کہ کسی موقع سے ان کو یہاں بلایا جائے لیکن دفعتاً عبید اللہ صاحب کا یہ خط ملا کہ:

"یہ افسوس ناک خبر دی جاتی ہے کہ الحاج محمد عبدالرشید صاحب لکچرار عربی نیو کالج مدراس پچھلی رات انتقال فرما گئے۔ آج ۴ بجے شام شہر مدراس کے مشہور صوفی حضرت دستگیر صاحب کے احاطہ قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

۱۹ جنوری کے دن مدرسہ محمدی باغ دیوان صاحب میں ظہر کی نماز کے وقت ملاقات ہوئی تھی آپ کے روانہ کردہ مکتوب کا ذکر کیا تھا، ساتھ ہی ساتھ معارف ماہ دسمبر بھی طلب کیا تھا، مرحوم ۲۱ جنوری کو تین بجے اپنے ایک پڑوسی کے جنازہ میں شریک ہوئے شام اپنے ایک عزیز کے جنازہ میں شرکت کے لیے شہر سے ۲۰ کلو میٹر پر روانہ ہوئے واپسی میں بے چینی محسوس کی، مکان پہنچے تو سینہ میں شدت پیدا ہوئی، اسی وقت سرکاری دواخانہ لے گئے ڈاکٹروں نے تصدیق کی کہ انتقال کر گئے۔"

یہ خط پڑھ کر بڑا صدمہ ہوا لیکن مشیت ایزدی میں کس کو دخل ہے اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین!

ادبیات

حمد باری

از جناب ابوالبیان حماد*

مرے رب مشفق و مہرباں تری شان جل جلالہ — کہ ہے تو ہی خالق دو جہاں تری شان جل جلالہ

ترا اختیار ہے فرش پر ترا اقتدار ہے عرش پر — تو ہے لازماں تو ہے لامکاں تری شان جل جلالہ

ترا جلوہ ہر سر طور ہے ترا نور کیف و سرور ہے — ہے ترا ظہور بہ کن فکاں تری شان جل جلالہ

تجھے ڈھونڈتا ہوں جہاں جہاں تو ملا ہے مجھکو وہاں وہاں — تو ہے ہر جگہ تو نہیں کہاں تری شان جل جلالہ

تو مری نگاہ سے دور ہے رگ جاں سے پھر بھی قریب ہے — ہے فقط حجاب ہی درمیاں تری شان جل جلالہ

وہی میرے واسطے عید ہے وہی وقت وقت سعید ہے — ہو مری جبیں ترا آستاں تری شان جل جلالہ

تو علیم غیب و شہود ہے ترے آگے سر بسجود ہے — مرا قلب زار مری زباں تری شان جل جلالہ

جو میں بھول جاؤں تجھے کبھی ترا در کبھی جو میں چھوڑ دوں — مجھے پھر ملے گی کہاں اماں تری شان جل جلالہ

تری ذات فہم سے ماورا تری سب صفات ہیں برملا — تو کہیں نہاں تو کہیں عیاں تری شان جل جلالہ

جسے چاہے زندہ کرے ہے تو جسے چاہے مردہ بنائے تو — ہے یہ تیری قدرت بے کراں تری شان جل جلالہ

تو فقیر کر دے امیر کو تو کسی کو خوب نواز دے — ہے کبھی بہار کبھی خزاں تری شان جل جلالہ

کسی کو تخت عطا کرے تو کسی کا تاج گرا بھی دے — تری شان بھی ہے عجیب شان تری شان جل جلالہ

تری حمد حمد کثیر ہے ترا ذکر ذکر کبیر ہے — یہ ابوالبیاں کرے کیا بیاں تری شان جل جلالہ

* جامعہ دارالسلام، عمرآباد۔

غزل

از ڈاکٹر محمد حسین فطرت بھٹکلی*

اک نکتۂ تاریخ اُمم بھول گئے ہیں — ہم رابطۂ سیف و قلم بھول گئے ہیں

مریخ و قمر کی وہ سیاحت میں ہیں معروف — لیکن سفر راہ عدم بھول گئے ہیں

دانش کدۂ علم تھیں ماضی میں مساجد — یہ راز مگر اہل حرم بھول گئے ہیں

ہم صبر کے بندوں کو ہے اک مسئلہ درپیش — ارباب ستم مشق ستم بھول گئے ہیں

اللہ کسی کو نہ دے یہ شوخ مزاجی — دربار کے آداب کو بھول گئے ہیں

فاقہ بھی تو اک سنت محبوب خدا ہے — کیوں اس کو پرستار شکم بھول گئے ہیں

تبلیغ سر کوئے بتاں بھی ہے ضروری — داعی جو ہیں وہ کوئے صنم بھول گئے ہیں

ہے حادثۂ وقت کی تفصیل الم ناک — توقیر قلم اہل قلم بھول گئے ہیں

فطرت ترا انداز نگارش نہیں بدلا

کتنے فضلا رحسن رقم بھول گئے ہیں

---

* شوکت علی روڈ، بھٹکل۔

کلیات شبلی

مولانا کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ جس میں مثنوی صبح امید، قصائد جو مختلف مجلسوں میں پڑھے گئے اور وہ تمام اخلاقی، سیاسی، مذہبی اور تاریخی نظمیں جو کانپور، ٹرکی، طرابلس، بلقان، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے متعلق لکھی گئی ہیں۔ یہ نظمیں درحقیقت مسلمانوں کی چہل سالہ جد وجہد کی ایک مکمل تاریخ ہے۔

قیمت ....۲۵ روپے

مطبوعات جدیدہ

اندلس میں علوم قرات کا ارتقاء از پروفیسر ڈاکٹر محمد نسیین مظہر صدیقی ندوی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۴۲۸، قیمت ۱۶۵ روپے، پتہ: ادارۂ علوم اسلامی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

مملکت ہسپانیہ کی تاریخ کا ہر باب زریں اور دلکش ہے، معرکہ آرائیوں، جاہ وحشم کی داستانوں اور علم وتعلیم، تہذیب وتمدن، فنون جمیلہ خصوصاً فن تعمیر میں وہاں کے مسلم فرماں رواؤں کے نقوش اب تک تابدار ہیں، اس کتاب کے فاضل مصنف کو اندلس مرحوم کی تاریخ سے خاص شغف ہے جو طویل عرصہ سے ان کے درس ومطالعہ کا خاص موضوع بھی ہے۔ یہ عالمانہ کتاب ان کے اسی مطالعہ کا نتیجہ ہے اور اردو کے ذخیرۂ اندلسیات میں منفرد ہے، مضامین دو حصوں یعنی علوم قرات کی تعلیم وتدریس اور تصنیف وتالیف میں اس سلیقہ سے منقسم ہیں کہ آغاز یعنی پہلی صدی ہجری کے اواخر سے تیرہویں صدی عیسوی تک ہر صدی کے قراء، ان کے مراکز اور فنی ارتقاء کی جامع تصویر، خوبصورت ودلکش پیراہن میں جلوہ گر ہوجاتی ہے، مثلاً گیارہویں صدی کے جائزہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس دور میں قرائے کرام اور ان کے مراکز علم وفن کی کثرت آیندہ دو صدیوں میں ماہرین قرأت کی عظیم الشان کثرت وفراوانی کا پیش خیمہ ہے، اس طرح ہر صدی کے خاتمہ پر اس فن کے عروج وزوال کا گہرائی سے جائزہ لیا گیا جس میں اس فن شریف پر اندلسی کتابوں کے تعارف کا حصہ بڑا قیمتی ہے، گو فاضل مصنف نے اپنے اس نقش کے کامل وجامع ہونے کا دعویٰ نہیں کیا لیکن ان کا یہ احساس بجا معلوم ہوتا ہے کہ

یہ نقش ناتمام بھی خون جگر کے بغیر صورت پذیر نہیں ہوا ہے، حسن کتابت و طباعت کے علاوہ چند جغرافیائی نقشوں سے بھی یہ مزین ہے۔

تحفۃ القاری از منصور بن چاند محمد، مرتبین پروفیسر محمود حسین شیخ و پروفیسر محبوب حسین عباسی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۳۶، قیمت ۱۲۵ روپے، پتہ: حضرت پیر محمد شاہ درگاہ شریف ٹرسٹ، احمد آباد، گجرات۔

سرزمین گجرات کو سرزمین اولیاء ہونے کا فخر حاصل ہے۔ نویں صدی ہجری کے حضرت قاضی محمود دریائی بیرپوری کا تعلق بھی اسی سرزمین سے تھا جن کی بزرگی اور کرامت کی روایتیں بہ کثرت مشہور ہیں، گو یہ مبالغہ سے خالی نہیں تاہم ان کے بعض ملفوظات میں بھی ان کے مجاہدوں اور ریاضتوں کا ذکر ملتا ہے، ان ملفوظات کے متعدد مجموعے محفوظ ہیں، ان میں ایک زیر نظر مجموعہ تحفۃ القاری بھی ہے جو اقوال و حکایات، لطائف و نکات اور فارسی و گوجری اشعار پر مشتمل اور صاحب ملفوظات کے سوانح اور ان کے عہد کے تاریخی و معاشرتی حالات کا اہم ماخذ ہے، ایک جگہ شب قدر کی تعیین کے متعلق شیخ ابوالحسن خرقانی کا قول منقول ہے جس میں آخری عشرہ کی مختلف تاریخوں کا تعیین کیا گیا ہے، اس میں ۱۷ اور ۱۹ رمضان کو بھی شب قدر کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔ صاحب ملفوظات صاحب دیوان شاعر بھی تھے اور اپنے زمانہ کی روایت کے برعکس بجائے فارسی زبان کے گوجری زبان میں شاعری کی، جس کے نمونے کثرت سے زیر نظر کتاب میں بھی شامل ہیں، یہ اشعار اردو کی اولین و قدیم ترین بنیاد ہیں، اس لحاظ سے اس کتاب کی اہمیت سوا ہو گئی ہے، شروع میں فاضل مرتب پروفیسر محمود حسین شیخ کے قلم سے مقدمہ ہے، جس میں انہوں نے کتاب کے مضامین و شمولات کا جامع خلاصہ بیان کر دیا ہے۔ اصل کتاب میں بھی ہر فصل کے آخر میں

ضروری حواشی دیے گئے ہیں۔ اس مفید کتاب کے اردو ترجمہ کی ضرورت بھی ہے۔

دلی اور طب یونانی از جناب حکیم سید ظل الرحمن، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۱۴، قیمت ۸۰ روپے، پتہ: اردو اکادمی دہلی گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی۔

حکومت و سیاست، مذہب و اخلاق اور شعر و ادب کے مانند اقلیم طب کے پایہ تخت ہونے کا افتخار بھی دلی کو حاصل ہے لیکن ابھی تک دلی کے اطباء کے موضوع پر کوئی مستقل مستند و مفصل کتاب موجود نہیں تھی، اس کی تلافی زیر نظر کتاب کا مقصد تالیف ہے اور حق یہ ہے کہ یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہے جس میں حکیم رکنا کاشی سے حکیم عبدالحمید دام مجدہ تک قریباً ساڑھے تین سو اطباء و حکماء کے حالات و سوانح اس طرح یکجا کیے گئے کہ اس علم و فن شریف کے عروج و ارتقاء کی منزلیں بھی واضح ہو گئی ہیں، خاندان شریفی و بقائی کے قریب تمام ناموروں کا احاطہ کیا گیا ہے وہیں بعض ایسے اطباء بھی ہیں جنھوں نے نسبتاً شہرت کم پائی، اس کتاب کے ذریعہ ان کا نام نیک ضایع ہونے سے محفوظ ہو گیا، ان اطباء کے علاوہ دلی کے بعض نامور جراحوں اور عطاروں کا بھی ذکر ہے، ایک جدا مضمون غالب اور طب کے لیے خاص ہے، دلی کی طبی عمارتوں کا جائزہ بھی ہے اور شروع میں عہد سلطنت میں فن طب کی موجودگی و ترقی پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے، خوبصورت زبان اور دلکش اسلوب کتاب کی نمایاں صفت ہے، جس کی وجہ سے 'اپرانے لگے' جیسے افعال بھی پر لطف و برمحل نظر آتے ہیں۔

نذرانہ اشک از جناب مولانا ثناء اللہ عمری، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۶۸، قیمت درج نہیں، پتہ: ندوۃ المحدثین، گجرانوالہ پاکستان۔

اس کتاب کے فاضل مولف کے تعزیتی و تاثراتی اور سوانحی مضامین ملک کے مختلف رسالوں میں برابر شایع ہوتے رہتے ہیں، جن کے ایک مجموعہ کا ذکر ان صفحات میں پہلے آچکا ہے، زیر نظر کتاب بھی قریباً پچاس خاکوں اور مضامین پر مشتمل ہے، جس میں انہوں نے اپنے بزرگوں، اساتذہ، اعزا و اقربا و احباب کے حالات قلم بند کیے ہیں، جنوب ہند کے ان حضرات نے گو شہرت کم پائی، لیکن ان کے علم و عمل، حسن اخلاق اور شعر و ادب کے بلند و پاکیزہ ذوق کا یہ پُر کیف اور دلکش ذکر آنے والی نسلوں کی راہ نمائی کے لیے کسی درجہ کم نہیں۔ پاکستان کے ادارۂ ندوۃ المحدثین نے اسے بہترین طباعت سے مزین کر کے قدر دانوں کو بلا قیمت تقسیم کرنے کی نیت سے شایع کیا، ابتدا میں اس کے ناشر جناب ضیاء اللہ کھوکھر کے قلم سے ایک جامع تحریر بھی ہے۔

عالمی اخوت اور بھائی چارگی کے فروغ میں حج کا رول زیر اہتمام انجمن خادم الحجاج، بہترین کاغذ و طباعت، مصور، صفحات، ۱۴۲، قیمت درج نہیں۔

پتہ: انجمن خادم الحجاج، کلکتہ ۳، ۷۰۰۰۷

عازمین حرمین شریفین کی خدمت و راحت رسانی کے لیے کلکتہ میں چند اہل خیر و دردمند حضرات نے انجمن خادم الحجاج قائم کی، گذشتہ برس اس کے دس سال پورے ہونے کے موقع پر ایک مجلس مذاکرہ کا انعقاد کیا گیا، زیر نظر یادگاری مجلہ میں اس سمپوزیم کے مقالات و پیغامات جمع کیے گئے ہیں، حج اور عالمی اخوت کے موضوع پر عمدہ تحریروں، بعض مشاہیر حجاج کے سفرناموں کی تلخیص، آیات و احادیث کے حسن انتخاب اور کمپیوٹر کی کتابت کے دلکش نمونوں اور خوبصورت تصویروں سے اس کے مرتبین کا حسن سلیقہ نمایاں ہے۔

ع۔ ص۔